Regd. L. No. 7243

Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1971

اِس پرچے میں

کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

بدل اشتراک پاکستان ـــ سالانہ ـــ دس روپے غیر ممالک ـــ سالانہ ـــ ایک پونڈ	**قیمت فی پرچہ** ایک روپیہ	**ٹیلیفون** ۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ ـ بی ـ گلبرگ ـ لاہور

جلد (۲۴) ـــ جنوری ـــ نمبر (۱)

فہرست

لمعات ـــــــــــــــ ۲

حقائق وعبر ـــــــــــــــ ۱۷

نقارئی ارشادات ـــ (محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ـــ ۲۳

قدیم وجدید کی کشمکش ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۲۵

مذاکرہ ـــــــــــــــ ۵۷

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۷۷

طلوع اسلام کالج فنڈ ـــ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ۷۹

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: سراج الحق، مقام اشاعت ـ ۲۵ ـ بی گلبرگ لاہور، پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ ـ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملت

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کا دن ہماری تاریخ میں یادگار رہے گا۔ سطحِ بین نگاہوں نے فقط اتنا ہی دیکھا کہ اس دن پاکستان کی زندگی میں پہلی بار مجلسِ آئین (دستور ساز) کے لئے بالغ حق رائے دہی کی بنا پر براہ راست انتخابات عمل میں آئے۔ لیکن دیدۂ بصیرت نے اس میں ایک عظیم انقلاب کے آثار مضمر دیکھے۔ اور وہی آثار درحقیقت ان سطور کی تسوید کے محرک ہیں۔ جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے وہ بھی یقیناً ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کے لئے ہم سب سے پہلے صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خان کو مستحق تہنیت سمجھتے ہیں جنہوں نے اپنے اس وعدے کو بطریق احسن پورا کر دکھایا کہ وہ اختیارات قوم کو سونپنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سزاوارِ مبارک باد سمجھتے ہیں اپنی قابلِ فخر افواجِ قاہرہ کو جنہوں نے قوت کے استعمال کے بغیر اس ملک گیر ہنگامہ میں ایسا امن قائم رکھا کہ یوں نظر آتا تھا جیسے لوگ عید منا رہے ہوں اور آخر میں ہم قابلِ تحسین و تبریک سمجھتے ہیں الیکشن کمشنر جسٹس عبدالستار کو جن کے حسنِ تدبر نے اتنے وسیع و عریض پروگرام میں کوئی پیچیدگی نہ پیدا ہونے دی۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ الیکشن کمشنر صاحب اپنے ان تمام رفقائے کار کے جنہوں نے انتخابی مشینری میں نمایاں حصہ لیا ہے تاثرات اور تجربات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں محفوظ کر لیں تاکہ وہ آئندہ انتخابات میں راہ نمائی کا کام دے سکیں۔ الیکشن کمیشن کو اب حکومت کی مشینری کا ایک مستقل شعبہ قرار پا جانا چاہیئے۔ اس کے بعد لیجئے اس انقلاب کو جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

۔۔ پرویز صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف معارف القرآن کی تیسری[1] جلد میں داستانِ بنی اسرائیل کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا۔

---

[1] طبع ثانی کے وقت اس کا نام برقِ طور رکھ دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اسی نام سے متعارف ہے۔

فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہی گوشے نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ استبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں، برہمنیت کی خواب آور و فسوں خیز فریب کاریاں، اور سرمایہ داری کی پرسکوت خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر ایک فتنہ بجائے خویش انسانیت کا کلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر، سبعیت و بربریت کے ایسے ہولناک عفاریت، فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم، اور دریا کی سکون انگیز روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ دانہ در موجود ہوں، وہاں خدا کی مخلوق پر کیا قیامت گذر رہی ہوگی؟ تاریخ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، برہمنیت (مذہبی پیشوائیت) کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر، اور قارون، نظامِ سرمایہ داری کی لعنت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ یہ تینوں یکجا، اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت۔

اور جس زمانے میں یہ سطور لکھی گئی تھیں (یعنی ۱۹۴۵ء میں) ہندوستان میں امتِ مسلمہ کی حالت بنی اسرائیل سے بھی زیادہ قابلِ رحم ہو چکی تھی ـــــ وہ امت جسے علامہ اقبالؒ نے ـــــ اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری ـــــ کے عبرت انگیز الفاظ سے پکارا تھا۔ لیکن اس وقت (۱۹۴۵ء میں) ملتِ اسلامیہ ہندیہ اس ذلت آمیز عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری توانائی اور یکجہتی سے مصروفِ جد و جہد تھی۔ پرویز صاحب نے اسی زمانہ میں اس کی وضاحت کر دی تھی کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے ہر وہ نظامِ حکومت جو قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں، ملوکیت ہے۔ اور برہمنیت (یا پریسٹ ہڈ) کا تعلق ہندو مت یا عیسائیت ہی سے نہیں، جب اور جہاں بھی، دینِ خداوندی، انسانوں کے خود ساختہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کے علمبردار برہمنیت کے نمائندہ کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ طبقہ "ملا و پیر" کے لبادہ میں وجہ غارتگریٔ دین و دانش رہا ہے ـــ باقی رہی قارونیت، جو جس اقتصادی نظام میں معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہو، اسے سرمایہ داری کہا جائے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے ربوٰ کا نظام کہہ کر پکارا گیا ہے جسے اس نے خدا و رسول (نظامِ خداوندی) کیخلاف اعلانِ جنگ کہا ہے۔ ہندوستان میں انگریز اور ہندو دونوں اس سازش میں متحد اور ایک دوسرے کے مددگار اور معاون تھے کہ ملوکیت کے جس پھندے میں مسلمان گرفتار ہے، اس کے حلقے زیادہ سے زیادہ حد تک سخت اور مضبوط کرائے جائیں۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ، امیرِ کارواں، محمد علی جناحؒ کی قابلِ ہزار رشک قیادت میں، دامِ ملوکیت کے ان حلقوں کے ٹوٹنے میں مصروفِ جہاد تھی، اور ان کی مذہبی پیشوائیت، ملوکیت کی گرفت

مضبوط کرنے کے لئے، ان کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل تھی ۔۔۔ جب فرعون کو اپنی شکست نظر آتی ہے تو وہ "موسیٰ" کے مقابلہ کے لئے ہامان اور اس کے جنود کو آگے بڑھاتا ہے ۔۔۔ یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ ان میں مختلف گروہ شامل تھے لیکن بہ ہیئتِ مجموعی انہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ ارباب مذہب جو دین کی اس اساسی حقیقت کی مخالفت کرتے تھے کہ قومیت کا مدار ملک و نسب کا اشتراک نہیں، ایمان کا اشتراک ہے۔

لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ ایک اور تھا ۔۔۔ گروہ نہیں، وہ ایک فرد تھا۔ نیشنلسٹ علماء قومیت کے اسلامی تصور کے انکار لہٰذا تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں، نکھر اور ابھر کر سامنے آئے تھے۔ لیکن اس شخص نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے نہایت پُرفریب طریق اختیار کیا تھا۔ اس نے متحدہ قومیت کی مخالفت بھی کی اور اس طرح مسلمانوں میں اپنا اعتماد قائم کیا۔ اور اس کے بعد تحریکِ پاکستان اور قیادتِ ملیہ (قائداعظمؒ) کی اس طرح مخالفت شروع کر دی کہ بظاہر معلوم ہی نہ ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان صاحب کے عزائم بڑے گہرے اور منصوبے شدید خطرناک تھے۔ عام طور پر فرعون اور ہامان اپنے دوائرِ اقتدار الگ الگ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے یورپ میں کلیسا (CHURCH) نے ان دونوں دوائر کو یک جا کر کے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی، اور یوں کہیئے کہ کلیسی کی ایسی طرح ڈالی جو نوعِ انسان کے لئے دارورسن کے حلقہ سے بھی زیادہ خناق تھی۔ ان صاحب کے سامنے اقتدار کا یہی تصور تھا۔ یہ خدا کے نام پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ تھے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جنہوں نے بعد میں ایک تنظیم کی بنیاد رکھی جسے انہوں نے جماعتِ اسلامی کے نام سے موسوم کیا۔ طلوعِ اسلام بدرگاہِ رب العزت جس قدر بھی سجدہ ہائے تشکر ادا کرے، کم ہیں کہ اس نے اسے وہ بصیرت عطا کی جس سے اس نے، اس خطرہ کو اُس وقت بھانپا جب کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ مقدس لبادہ بھی کسی قسم کے خطرہ یا نقصان کا موجب ہو سکتا ہے۔ طلوعِ اسلام نے ۱۹۴۰ء میں، اس کے خلاف آوازِ بلند کی ۔۔۔ ۱۹۴۰ء میں جب ابھی اس جماعت کی محسوس شکل بھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں نیشنلسٹ علماء کا تصادم ختم ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آگیا۔ اور (قوم کی بدقسمتی کہ) یہ مقدس طائفہ، اپنے تمام خطرناک عزائم کو اپنے سینے میں لئے، سب سے پہلے یہاں آموجود ہوا۔ اس دن سے آج تک طلوعِ اسلام کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا ہو جس میں اس نے قوم کو اس مہیب اور پُرفریب خطرہ سے آگاہ نہ کیا ہو۔ اس میں اسے کس قدر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ۔۔۔ حق و باطل کے تصادم میں کون سا ایسا معرکہ ہے جس میں داعیانِ حق و صداقت کو تکالیف کا مقابلہ اور پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مقامِ تشکر و امتنان یہ ہے کہ اس طویل و پُرخار راستے میں اس کا قدم جادۂ استقامت سے ذرا بھی نہیں

ڈگمگایا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اس معرکہ میں طلوعِ اسلام تو تنہا تھا لیکن ہامان کے ساتھ قارون کے خزانے بھی شامل تھے، اور طلوعِ اسلام کو پیشوائیت اور سرمایہ داری دونوں کا مقابلہ تنہا کرنا تھا ـــــ ایسا تنہا کہ اکثر مقامات پر بیگانے تو ایک طرف، خود اپنوں کے دل میں بھی شکوک ابھر آنے لگتے کہ اس مسلسل مخالفت کا حاصل کیا؟ لیکن طلوعِ اسلام نے ہمت نہ ہاری اور تمام موانعات کے باوجود اپنی پکار کو دہراتے چلا گیا ـــــ اور اس کے ساتھ ہی ملائیت کے جنود بھی بڑھتے چلے گئے۔

لیکن طلوعِ اسلام کی نگاہیں ان کائناتی قوتوں کی غیر محسوس یلغار پر تھیں جنہیں عرفِ عامہ میں زمانہ کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی رفتار تو، ہمارے حساب و شمار سے، نسبتاً سست ہوتی ہے لیکن جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ان کی گرفت ایسی سخت ہوتی ہے کہ یہ باطل کے ہر کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ، ہمارے اس قول کی زندہ و پائندہ شہادت ہے۔ حکیم الامت کو جس قرآنی بصیرت نے آج سے پہلے یہ دکھا دیا تھا کہ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

اُسی فراستِ قرآنی نے طلوعِ اسلام کے سامنے بھی اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا کہ اب مذہبی پیشوائیت اور اس کے مؤید نظامِ سرمایہ داری کا زمانہ ختم ہو رہا ہے، اور جسے دنیا ان کا جوش و خروش سمجھ رہی ہے، وہ درحقیقت ان کی حرکتِ مذبوحی یا رقصِ بسمل ہے۔ چنانچہ یہ کائناتی "قوتیں ابھریں" اور انہوں نے ایک ہی ضربِ کلیمی سے، ہامان و قارون کے مہیب جناتی بتوں کو اس طرح پاش پاش کر کے رکھ دیا جس طرح صاحبِ ضربِ کلیم نے گوسالۂ سامری کو پیس کر اس کی راکھ تک سمندر میں بہا دی۔

ہم نے اس الیکشن کے جھکڑ کو اسی آئینے میں دیکھا ہے۔ یہ درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی نشتر تھی جس نے نشۂ قوت کے جنون آفریں خون کے دباؤ کی فصد کھول کر رکھ دی۔ آپ ذرا، ان لوگوں کے الیکشن سے پہلے کے بیانات کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ ان سے، ان کے تکبر و رعونت کے شعلے کس طرح ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ۔ یہ خدا کو فریب دیتے تھے، اس طرح کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ اپنی ہوس پرستیوں کے لئے اسکیمیں بناتے تھے اور انہیں دینِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے تھے اور یہ سب اس لئے لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲/۷۹) تاکہ اس سے کچھ دنیاوی مفادات حاصل کئے جائیں ـــــ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ـــــ اور یہ مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے یہ کہہ کر

کہ ہم اقامتِ دین اور نصبِ نظامِ اسلامی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ جدوجہد سب کی سب باطل کی تنصیب و تقویت کے لئے تھی ـــ اور خدا کا فیصلہ یہ تھا کہ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ (۲/۹) یہ تو خدا کو دھوکا دیتے ہیں نہ مسلمانوں کو، بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کی اس خود فریبی کا پردہ الیکشن کے نتائج نے اس بُری طرح سے چاک کر کے رکھ دیا کہ ان کے چہرے کے اصلی خدوخال ساری دنیا کے سامنے نکھر کر سامنے آگئے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا۔ یوں ان لوگوں کی جڑ تک کٹ گئی جنہوں نے ظلم کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (۶/۴۵) اور یہ سب کچھ خدا کے اس پروگرام کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے ہوا جس نے نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ ربوبیتِ عالمین کے راستے میں جو بھی روک بن کر کھڑا ہوگا اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے اعمال کے موازنہ (وزن کرنے) کے لئے آپ ہی ترازو بلند کئے۔ سو نتائج نے بتا دیا کہ بعض مقامات پر یہ ہوا کہ لَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵) ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ اور جہاں میزان کھڑی کی گئی وہاں مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ۔ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۸-۹) کا ذلت آمیز نظارہ سامنے آگیا ـــ یعنی ان کا پلڑا اتنا ہلکا ثابت ہوا کہ اس نے انہیں تباہی و بربادی کے عمیق جہنم میں دھکیل دیا۔ اور ان سے کہا گیا کہ ذُقْ۔ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ۔ (۴۴/۴۹) اب اپنی فریب سازیوں کا مزہ چکھو۔ تم اپنے آپ کو بڑا معزز اور صاحبِ اقتدار سمجھا کرتے تھے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اس الیکشن نے، ہامان و قارون کے بتوں ہی کو نہیں توڑا، ان کے ساتھ اور دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو بھی پاش پاش کر دیا ہے۔ آپ ذرا سابقہ الیکشنوں پر ایک نگاہ ڈالئے۔ ان میں ووٹ ڈالنے کا معیار ذات اور برادریوں کے بندھن ہوتے تھے۔ ارائیں برادری کے ووٹ ارائیں امیدوار کے لئے، کشمیری برادری کے کشمیری امیدوار کے لئے، جاٹوں کے جاٹ کے لئے، اعوانوں کے اعوان کے لئے ـــ اور اس الیکشن میں کیا ہوا؟ ذاتوں، برادریوں گوتوں کے یہ سب بندھن ٹوٹ گئے۔ اور ووٹ صرف ایک نظریہ کو دیئے گئے کسی سے پوچھا تک نہیں کہ امیدوار کا نام کیا ہے اور اس کی خصوصیات کیا۔ سیدھے پولنگ اسٹیشن پر گئے اور اپنے پسندیدہ نظریہ کی علامت کو ووٹ دے کر چلے آئے ـــ یہ نظریہ نہیں بلکہ عوام کی صدیوں کا احتجاج تھا موجودہ انسانیت کش نظام کے خلاف ـــ اس سے بڑے بڑے چودھریوں کی چودھراہٹیں دھری کی دھری رہ گئیں، گاؤں کے سرداروں کی سرداریاں خاک میں مل گئیں۔ ڈیروں کی وڈیریت کے پرخچے اڑ گئے۔ مُلّا کی مزعومہ عظمت و احترام خواب پریشاں بن کر رہ گئی۔ حتیٰ کہ

پیرانِ طریقت کا وہ حصار، جو لوگوں کے قلب و دماغ کو اپنی گرفت میں لئے چلا آرہا تھا، فسونِ سامری بن کر رہ گیا۔ فتح صرف نظریہ کی ہوئی۔ نہ اشخاص کی، نہ حسب و نسب کی، نہ مال و دولت کی، نہ ملمع شدہ عقیدت و احترام کی، نہ فریب ساز و عاوی روحانیت کی۔ یہ بت پاش پاش ہو گئے۔

دوسری طرف یہ کامیابی بھی نہ کسی شخصیت کی تھی، نہ کسی پارٹی کی ـــ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کامیابی بالآخر کس کی تھی؟ یہ نکتہ غور طلب ہے۔

قرآنِ کریم نے اقامتِ نظامِ خداوندی کے دو مرحلے بتائے ہیں۔ ایک "کفر بالطاغوت" اور دوسرا "ایمان باللہ" (وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ .... (۲/۲۵۶) یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک، مشرب، نظام کو مٹایا جائے۔ اور جب یوں زمین ہموار ہو جائے تو پھر نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ اسی طریقِ عمل کو لا الٰہ الا اللہ کے نظریۂ حیات سے تعبیر کیا گیا ہے جب تک باطل کی تخریب نہ ہو حق کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ عمل، کسی حق پرست جماعت کے ہاتھوں ظہور میں آئے، تو طاغوت کی بساط الٹنے کے ساتھ ساتھ خدا کا تختِ اجلال بچھتا چلا جاتا ہے اور اس انقلاب میں فساد برپا نہیں ہوتا۔ یہ وہ انقلاب تھا جو محمد رسول اللہ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ لیکن اگر یہ تبدیلی زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں بروئے کار آئے تو پہلے صرف تخریب ہوتی ہے اور اس کے بعد تعمیر کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے ہاں جو اس وقت، حسب و نسب، جھوٹی عزت، دولت و حشمت، مذہبی پیشوائیت، روحانی مولائیت، کے طاغوتی بت ٹوٹتے ہیں تو یہ زمانے کے تقاضوں کے جھٹکے کا نتیجہ ہے۔ یہ صرف حصہ لا ہے۔ یہ الا کے مرحلہ کی تمہید ہے۔ اس نے اس مرحلہ کے لئے میدان صاف کیا ہے۔ لہٰذا یہ کامیابی ہے فطرت کے اس پروگرام کی، جس کی رُو سے کائنات میں عملِ ارتقا جاری و ساری ہے ـــ اور فطرت کے عملِ ارتقاء کا نو طریق ہی یہ ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہم جو کہتے چلے آرہے تھے کہ سوشلزم کا اقتصادی نظام بے شک قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن جن بنیادوں پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے وہ قرآن کے نظریۂ حیات سے یکسر مختلف اور متضاد ہے، اور تاکید پر تاکید کر رہے تھے کہ نظامِ سرمایہ داری کی بساط الٹنا مقصود ہے تو اسے قرآنی پروگرام کے مطابق عمل میں لاؤ، تو اس سے مقصد یہی تھا کہ اس میں تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر ہوتی چلی جائے تاکہ ملک میں انقلاب تو آجائے لیکن فساد برپا نہ ہو۔ جو ارباب سیاست اس تبدیلی کا ذریعہ بنے ہیں، اگر ان کے دل میں انسانیت کا درد، اور ملک و ملت کی بہی خواہی کا صحیح جذبہ موجزن ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے ان کے سر پر بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ آپڑا ہے۔ اگر انہوں نے اس ذمہ داری کا احساس کر لیا اور اس تبدیلی کو اپنے لئے

حصولِ اقتدار کا ذریعہ خیال کرنے کے بجائے، ادائیگیٔ فرائض کا موجب سمجھ لیا جائے تو اس سے منفعت بخش نتائج مرتب ہو سکیں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو خدا نخواستہ) یہ بدنصیب سرزمین، ایسی تباہی کی آماجگاہ بن جائے گی جس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ (عام کہاوت ہے) اگر طاغوتی بھوتوں کو "نوری علم" کے ذریعے نکالا جائے تو گھر بس جاتا ہے اور اگر انہیں "کالے علم" کے ذریعے نکالا جائے تو وہ جاتے جاتے بھی ایسی لتاڑ دیتے ہیں کہ گھر ویرانہ بن جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، محترم ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے رفقاء کے لئے بہت بڑا امتحان (TEST) ہے۔ خدا کرے کہ وہ اس امتحان میں پورے اتریں ــــ لیکن وہ قرآنی رہنمائی کے بغیر اس میں پورے اتر نہیں سکتے۔

اس سلسلہ میں جو ذمہ داری خود طلوعِ اسلام پر عاید ہوتی ہے، اس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے حقیقت یہ ہے کہ طلوعِ اسلام کا وجود ہی اسی احساسِ ذمہ داری کا رہین ہے۔ اس نے اپنی اشاعت کے روزِ اوّل سے اپنے سامنے یہی مقصد رکھا اور آج تک اسی مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہے۔ اس نے تحریکِ پاکستان کے دوران بھی قوم کے راستے میں قرآنی شمعیں روشن کیں تاکہ اس کا قدم غلط سمت کو نہ اٹھ جائے ــــ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی اس نے اربابِ حل و عقد کو ہر دور میں پکارا اور انہیں قرآن کے تجویز کردہ صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دی۔ وہ ان کی بارگاہوں سے دور دور رہا تاکہ وہاں کی سحر انگیز فضائیں اس کے جذبۂ حق گوئی و بیباکی کو نرم خیز نہ بنا دیں۔ حتیٰ کہ یہ ملک کی عملی سیاسیات سے بھی کنارہ کش رہا تاکہ (غالب کے الفاظ میں) اس کی "اطاعت میں سے دانگبیں کی لاگ" تک نہ رہے۔ یہی اس کا مسلک آج تک رہا ہے اور یہی اس کے بعد بھی رہے گا۔ واللہ المستعان۔ ہم اربابِ سیاست اور ارکانِ نظم و نسق کے سامنے قرآنی راہنمائی کی شمعیں روشن کرتے چلے جائیں گے اور اس کے بعد ان سے کہہ دیں گے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ جس کا جی چاہے اس نورِ مبین سے اپنی نگہِ بصیرت کو مستنیر کر لے اور جس کا جی چاہے اندھا بن کر چلتا جائے ــــ اور اس طرح چلنے والوں کو خدا کے قانونِ مکافات کی یہ وعید بھی سناتے رہیں گے کہ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا (۱۸/۲۹) ہم نے ظلم کرنے والوں کے لئے آتشِ سوزاں کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے ان احباب کو جو طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کے ہمنوا ہیں، واضح الفاظ میں متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ اب ان کے سر پر بھی پہلے سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ آپڑا ہے۔ اس وقت تک ہماری کوششیں "کفر بالطاغوت" کے لئے صرف ہوتی رہیں۔ اب "ایمان باللہ" کا مرحلہ سامنے آ رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہو گی کہ ہم اپنی جد و جہد کو اور بھی تیز کر دیں۔ اب ہمارے سامنے بھی ایک نئی امتحان گاہ آ گئی ہے۔ خدا کرے کہ ہم بھی اس میں پورے اتریں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ــــــــ (٥) ــــــــ

ہماری سب سے پہلی گزارش مسٹر بھٹو سے ہے۔ مسٹر بھٹو طبعاً تیز واقعہ ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے بیانات، اعلانات، حتیٰ کہ اقدامات تک میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ اس قسم کی جلد بازی ہنگامی شورشیں برپا کرنے کے لئے تو مفید مطلب ہو سکتی ہے لیکن جس شخص کے ہاتھ میں قوم کی زمام تقدیر ہو اسے نہایت بردبار، اور متحمل مزاج ہونا چاہیئے۔ اسے بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر چلنا اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے اسے دس بار سوچنے کے بعد ایک لفظ زبان سے نکالنا چاہیئے[1]۔ اسے قوم سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کرنا چاہیئے جسے نباہنے میں عملی دشواریاں ہوں اور کوئی ایسی توقعات وابستہ نہیں ہونے دینی چاہئیں جن کا پورا ہونا ممکن نہ ہو ــــ پیپلز پارٹی اپنی ہنگامی سرگرمیوں کے دوران اس قسم کی جلد بازیاں کر چکی ہے جن کے نتائج ابھی سے سامنے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مؤقر جریدہ "مساوات" کو اپنی ۱۱ دسمبر کی اشاعت میں "انقلابی عمل کے بارے میں بعض غلط فہمیاں" کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم کرنا پڑا۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ

> ہم تک ایسی اطلاعات پہنچی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض حلقوں میں سوشلزم کے مقاصد اور طریق کار کے بارے میں غلط خیالات پائے جاتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ لاہور کی ایک بستی کے مکینوں نے جو پندرہ روپے ماہوار کے کوارٹروں کے کرایہ دار ہیں، کوارٹروں کے مالکوں کو کرایہ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ چونکہ محنت کشوں کا راج آچکا ہے، اس لئے ہم کوارٹروں کے مالک ہیں، کرایہ دار نہیں ہیں۔ یہ رجحان غلط اور فتنہ پرور ہے۔ دائیں بازو کے بعض ہارے ہوئے لیڈر اس کو ہوا دے رہے ہیں۔ جناب ممتاز دولتانہ کے ایک ساتھی نے اپنے دوستوں کو بتایا ہے کہ ہم اب پیپلز پارٹی سے بڑھ کر سوشلزم کا ڈنکا بجائینگے اور کہیں گے کہ پاکستان میں مزدور کی کم سے کم تنخواہ تین سو روپے ہونی چاہیئے، مزدور چونکہ اقتصادیات کے گورکھ دھندے، روپے کی قدر اور قیمت خرید و فروخت کی جزئیات کو نہیں سمجھتے، اس لئے ہمارے کہنے میں آکر غل مچائیں گے اور حالات خراب کریں گے۔ پرانے سیاستدانوں نے (اپنی شکست کے بعد) یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ روٹی اور مساوات کا ایسا چرچا کریں گے جو تاریخی، سیاسی اور اقتصادی طور پر ناقابل عمل ہو اور عوام میں گمراہی پھیلے۔

ہم جریدہ "مساوات" ــــ اور اس کی وساطت سے پیپلز پارٹی سے متعلقین کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ

---

[1] ہمارا ان سے یہ مشورہ بھی ہے کہ وہ کوئی انٹرویو یا بیان زبانی نہ دیں، ہمیشہ تحریری دیں تاکہ اس میں کسی تحریف یا الحاق کی گنجائش نہ رہے، جیسا کہ حال ہی میں لنڈن ٹائمز کے ایک نامہ نگار سے انٹرویو کے سلسلہ میں ہوا ہے۔

وہ، بجائے اس کے کہ سارا الزام مخالفین کے سر پر دھر کر، اپنے آپ کو خوش فہمی میں مبتلا رکھیں۔ انہیں چاہیئے کہ محاسبہ خویش کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے، اپنی جلدبازی اور مفاد عاجلہ کے حصول کے لئے، عوام میں اس قسم کے تأثرات پیدا کر دیئے تھے اور ہم انہیں بار بار متنبہ کرتے تھے کہ عوام کے دل میں اس قسم کی توقعات پیدا کرا دینا، بڑا خطرناک ثابت ہوگا۔ ہم نے جو کہا تھا کہ "انقلاب، فکر سے برپا ہوتا ہے ہنگاموں سے نہیں" تو اس کا مطلب یہی تھا کہ آپ "اقتصادیات کے گورکھ دھندوں، روپے کی قدر، اور قیمت خرید و فروخت کی جزئیات" کو عوام کے ذہن نشین کرائیں اور اس کے بعد انہیں بتائیں کہ یہ تبدیلیاں کیسے لائی جائیں گی۔ آپ نے یہ نہ کیا، اور اس کا نتیجہ سامنے ہے اس میں شبہ نہیں کہ مخالفین آپ کے پروگرام کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن جس تدبر کے ہم کہتے ہی اسے ہیں کہ مخالفین کو اس قسم کی سازشیں کرنے کا موقعہ بہم نہ پہنچایا جائے۔ اگر آپ ان توقعات کی چنگاریاں فضا میں نہ چھینکتے، تو آپ کے مخالفین انہیں ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کرنے میں کیسے کامیاب ہو سکتے تھے؟ ہماری آپ سے اب بھی یہ گزارش ہے کہ آپ کے ارباب دانش و بینش سر جوڑ کر بیٹھیں، حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں، اپنا نصب العین متعین کریں۔ اور پھر عوام کو سمجھائیں کہ اس نصب العین تک کس طرح آہستہ آہستہ، بتدریج پہنچا جائے گا۔ اور اس میں انہیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔ اسے سن رکھیئے، اور ہزار بار سن رکھیئے کہ "صحیح انقلاب" فکر کی رو سے برپا کیا جاتا ہے ہنگاموں سے نہیں"۔

ہماری آپ سے دوسری گزارش یہ ہے کہ جب آپ اپنے ہر پروگرام کے ساتھ اسلام کی وابستگی لازمی قرار دیتے ہیں، تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح تصور آپ کے سامنے ہو۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ "اسلام پسندوں" میں تو شاید ایک بھی نہیں، اور دوسرے طبقہ میں بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں معلوم ہو کہ اسلام ہے کیا؟ (معاف فرمائیے) ایسا کہنے میں نہ تو ہمیں کسی کی تحقیر یا تنقیص مقصود ہے اور نہ ہی اپنی تعلّی مطلوب۔ یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے کہ لوگوں کے نزدیک، اسلام سے مراد وہی مذہب ہے جو ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ دین نہیں جسے خدا نے عطا کیا تھا۔ اور جب تک مذہب اور دین کے اس بنیادی فرق کو نہیں سمجھا جاتا، اسلام کا صحیح تصور سامنے نہیں آ سکتا۔۔۔ آپ یاد رکھیئے کہ اگر آپ نے بھی اسلام سے، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کردہ مذہب ہی مراد لے لیا، تو نہ آپ کی سوشلزم چل سکے گی اور نہ ہی یہاں اسلام آ سکے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس باب میں مسٹر بھٹو پھر اپنی عادت، جلدبازی سے کام لے رہے ہیں۔ چنانچہ آج (۱۵ دسمبر) کی اخبارات میں ان کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو، اور آئین و قوانین سازی کے سلسلہ میں وہ علماء سے امداد لیں گے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے محض روشِ عامہ کی تقلید میں ایسا کہہ دیا ہے ورنہ اگر انہیں اس کا صحیح مفہوم معلوم اور اس کے عملی عواقب کا اندازہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کہتے۔ انہیں اتنا بھی

معلوم نہیں کہ خود "قرآن وسنت کے علمبردار" اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ قرآن وسنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر قابلِ قبول ہو۔ اور اس سلسلہ میں پہلے ہی بحث و نزاع کے دروازے کھل چکے ہیں۔ "قرآن وسنت" کے مدعی تو یہ کچھ کہہ رہے ہیں اور مسٹر بھٹو اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ ملک کا قانون قرآن وسنت کے مطابق مرتب ہوگا۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سمجھ رہے کہ ایسا کہنے سے وہ خود اپنے آپ کو کس جال میں پھنسا رہے ہیں۔ قرآن سے انہیں اپنے اقتصادی نظام کی تائید مل سکے گی لیکن جس چیز کو "سنت" کہہ کر حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کی طرف غلط منسوب کیا جاتا ہے وہ ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کی موید ہے۔ اگر انہوں نے اپنے آپ کو اس "سنت" کا پابند کر لیا اور اس کے بعد سوشلزم کا نظام رائج کرنے کی کوشش کی، تو خود ان کی اپنی (COMMITMENT) کی بنیاد پر ان کی ایسی مخالفت ہوگی جس کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں ہوگا۔ اور ان کا سارا کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ اور اگر انہوں نے اس کے باوجود اپنی سوشلزم کی ترویج پر ضد کی، تو اس سے مذہبی پیشوائیت جو ہنگامے برپا کرائے گی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر بھٹو کو اس کا علم و احساس نہیں کہ وہ اس قسم کے عاجلانہ اعلانات سے باطل کے اس عفریت کو جو اپنی موت آپ مر رہا ہے پھر سے سامانِ زندگی اور اسبابِ تقویت بہم پہنچا رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ نظامِ سرمایہ داری کے عفریت ایک جھٹکے سے مرنہیں جایا کرتے۔ وہ جلیں دم سے "زندہ کفن پوش" ہو جایا کرتے ہیں۔ اور اگر ان کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت برتی جائے تو وہ پھر سے اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں۔

(۲)

انتخابات کی تکمیل کے بعد سب سے پہلا مرحلہ آئین سازی کا ہوگا۔ اگرچہ قانونی نقطۂ نگاہ سے عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن صاحب، اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ تنہا آئین مرتب کر لیں، لیکن قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے بلکہ اس میں، کم ازکم پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر بھٹو کا تعاون ضرور چاہیں گے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے تعاون سے ایک سو بیس دن کی (متعینہ) مدت سے بھی کم عرصہ میں آئین مرتب ہو جائے گا۔ اس کے بعد اسے صدرِ مملکت کی توثیق کی ضرورت ہوگی۔ یہ توثیق اسی صورت میں ممکن ہوگی جب یہ آئین ان شرائط کو پورا کرے، جو صدرِ مملکت کے جاری کردہ "قانونی لائحہ عمل" (LEGAL FRAMEWORK ORDER) میں عاید کی گئی ہیں (ان شرائط کو عاید کرنا ان کی دور نگہی کا زندہ ثبوت ہے جس کے لئے ہم انہیں مستحقِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آئین کے نفاذ کے بعد، پارلیمان اس میں ترمیم و تنسیخ کی مجاز ہوگی لیکن وہ (صدرِ مملکت) اقتدار کا انتقال تو اسی آئین کے ساتھ کریں گے جو ان شرائط کو پورا کرے گا۔ عہدِ جمہوریت میں اس سے زیادہ احتیاط برتی بھی کیا جا سکتی ہے؟)۔ ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ

"اسلامی نظریہ جو قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے، اس کا تحفظ کیا جائے گا۔"

یہ شرط بڑی بنیادی اور نہایت اہم ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ "اسلامی نظریہ پاکستان" کی اصطلاح کے اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہونیکے باوجود، آج تک یہ متعین نہیں کیا گیا کہ اس سے مراد کیا ہے چنانچہ اب بھی یہ اصطلاح مبہم کی مبہم ہے۔ اس کا مفہوم سب سے پہلے واضعین آئین — یعنی شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر بھٹو متعین کرینگے اور اس کے بعد صدر مملکت — اس اصطلاح کی تفصیلات تو طول طویل ہیں، لیکن اصولی طور پر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم دو شقوں میں متعین کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی وہ دو شقیں تھیں جنہیں معتوبِ پاکستان — علامہ اقبالؒ — اور معمارِ پاکستان — قائد اعظمؒ — نے بہ تکرار و اصرار دہرایا تھا۔ یعنی

(۱) اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک۔ اس معیار کے مطابق ایک ہی مملکت میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ غیر مسلم، مسلم قومیت کا جزو قرار نہیں پا سکتے۔ یہ اس بنیاد کی پہلی اینٹ تھی جس پر مطالبہ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی، اور قرآنی نظامِ حیات کا اولین تصور۔

(۲) مملکت کی آزادی اور پابندی کے حدود ان اصولوں کی رُو سے متعین ہوں گے جو خدا کی کتاب (قرآن مجید) میں محفوظ ہیں اور جن میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر، اسلامی مملکت "قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی" کی ایجنسی ہوگی۔

جہاں تک قرآن مجید کے آئین اور قانون کی اساس ہونے کا تعلق ہے اس کے لئے حسنِ اتفاق سے زمین پہلے ہی سے ہموار ہو چکی ہے۔ مودودی صاحب جاتے جاتے ایک ایسا کام کر گئے ہیں جس سے اس راستہ کے وہ پتھر خود بخود دور ہو گئے ہیں جنہیں وہ اور ان کے ہمنوا گزشتہ تئیس برس سے گاڑتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اس کا اعلان کیا کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ انہوں نے اگرچہ یہ بات حنفی فقہ کی اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کہی تھی لیکن بہرحال یہ ایک ایسی حقیقت کا اعتراف تھا جس نے راستے کی مشکلات کا حل پیدا کر دیا۔ اب اس کے بعد مملکت کے آئین کے لئے دو ہی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں سیکولر نظام رائج ہو جائے اور دوسرے یہ کہ قرآن خالص کو آئین اور قانون کی اساس قرار دیا جائے کیونکہ قرآن، تمام فرقوں کے نزدیک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیکولر آئین (علاوہ اس کے کہ یہ یکسر کفر کا نظام ہے) اس لئے بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکیگا کہ یہ صدر مملکت کے قانونی لائحہ عمل کی بنیادی شرط کے خلاف جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ایک ہی صورت باقی رہ جائے گی کہ آئین کی اساس قرآن کو قرار دیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ دین کا صحیح تصور سامنے آ جائے گا بلکہ مسٹر بھٹو بھی ان مشکلات سے بچ جائینگے

جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور ملک اس فرقہ وارانہ خانہ جنگی سے بھی محفوظ ہو جائے گا جو "سنت" جیسی اختلافی چیز کو قانون کی اساس قرار دینے، یا کسی ایک فرقہ کی فقہ کو ملکی قانون کی حیثیت سے نافذ کرنے کا لازمی نتیجہ ہے اور جس کی طرف مختلف فرقے پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔ ہم سردست اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعند الضرورت ہم ان تفاصیل کو ایک بار پھر سامنے لانے کی کوشش کریں گے جنہیں ہم گزشتہ تیئیس سال سے بار بار دہراتے چلے آتے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن صاحب اپنے چھ نکات پر زور دیئے جا رہے ہیں لیکن ہمیں امید ہے کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہو گا کہ ان نکات کی بنیادوں پر مرتب کردہ آئین، صدرِ مملکت کے قانونی لائحہ عمل کی ایک اہم شرط کو پورا نہیں کرے گا جس میں کہا گیا ہے کہ آئین ایسا ہونا چاہیئے جس سے مملکت کی وحدت اور سالمیت کو ضعف نہ پہنچے۔ ویسے بھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا تصور اب خود مجیب صاحب کے مفاد کے بھی خلاف ہو گا۔ جس شخص کو پوری مملکت کا اقتدار حاصل ہو جائے وہ اسے چھوڑ کر اس کے صرف ایک حصے کے اقتدار پر اکتفا کیوں کرے؟ علاوہ ازیں وہ اپنے عوام سے کہہ رہے ہیں کہ ان کا دان کے خیال کے مطابق) مغربی پاکستان پر جو قرضہ ہے وہ اس کی ایک ایک پائی واپس دلائیں گے۔ یہ واپسی تو اسی صورت میں ہو سکے گی جب مغربی پاکستان کا مرکزی اقتدار بھی ان کے ہاتھ میں رہے۔ دوسری طرف مولانا بھاشانی نے جو علیحدگی کا نعرہ بلند کیا ہے اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کے اندازے کے مطابق مجیب صاحب اس دعویٰ سے دستبردار ہو جائیں گے اور بھاشانی صاحب اس طرح وہاں کے عوام کو اپنے پیچھے لگانے کے قابل ہو سکیں گے۔ ان قرائن سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مجیب صاحب چھ نکات سے نیچے اُتر کر آئین کو ترتیب دیں گے اور یوں مسٹر بھٹو کے تعاون کی شکل پیدا ہو جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجیب صاحب اگر مشرقی پاکستان کو بھی دو تین صوبوں میں تقسیم کر لیں۔ ویسے اگر کسی کے دل میں ملک کی سالمیت کا درد ہے تو ہمارے نزدیک اس کے حصول کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں کہ مملکت میں وحدانی انداز ـــــ (UNITARY FORM) کی حکومت قائم کی جائے اور صوبوں کی جگہ انتظامی حلقے قائم کر دیئے جائیں۔ لیکن موجودہ بحران میں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

——— (۰) ———

مسٹر بھٹو اگر فی الواقعہ سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان ترین شکل وہ تجویز ہے جسے ہم نے دو سال پہلے پیش کیا تھا۔ یعنی آمدنی کی بنیاد پر انتخابات ـــ سرمایہ بجائے خویش کوئی قوت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ سرمایہ دار اپنے سرمائے سے قوت خریدتا ہے اور جمہوری اندازِ حکومت میں قوت کے معنی ہوتے ہیں مجالس قوانین ساز میں مؤثر مقام کا حصول۔ انتخابات کے موجودہ نظام کی رُو سے ان مجالس میں نشستیں روپے کے زور سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہماری پیش کردہ تجویز کی رُو سے شکل یہ ہو گی کہ مثلاً ملک میں جتنے لوگوں کی آمدنی ایک سو روپیہ ماہوار تک ہو، انہیں ایک وحدت تصور کر لیا جائے اور ان کی آبادی کی نسبت سے اس حلقے کی نشستیں مقرر کی جائیں۔ اس میں

ووٹرز بھی اسی آمدنی کے مالک ہوں اور امیدوار بھی (کم از کم تعلیم کی شرط کے ساتھ)۔ اسی طرح سے آمدنیوں کو بڑھا کر حلقے قائم کرتے چلے جائیں۔ جوں جوں حلقہ اوپر اٹھیگا اس میں نشستوں کی تعداد کم ہوتی چلی جائیگی۔ حتیٰ کہ سب سے اونچے ۔ بائیس خاندانوں پر مشتمل ۔۔۔ حلقے کے حصے میں شاید ایک نشست بھی نہ آسکے۔ اس طرح مجالسِ قوانین سازمیں مؤثر حیثیت سرمایہ داروں کی نہیں بلکہ کم سے کم آمدنی والے افراد کی ہو جائیگی۔ جب اس طرح سرمایہ کی قوت ٹوٹ جائیگی تو سرمایہ داری میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی۔

لیکن ایسی شکل میں پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ یہ ایوانِ زیریں ہوگا۔ ایوان بالا ملک کے اربابِ فکر و نظر، اصحاب دانش و بینش اور ماہرینِ علوم و فنون پر مشتمل ہوگا۔ اس میں (مثلاً) فوج کے ریٹائرڈ کمانڈر انچیف اور جرنیل، مختلف ادوار کے صدر مملکت اور وہ وزراء جن کا کردار بے داغ رہا ہے۔ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان اور شفاف کردار کے سابقہ گورنرز، پروفیسرز، ڈاکٹرز، ماہرینِ قانون، ماہرینِ صنعت و حرفت، نیز ملک کے سکالرز وغیرہ اس ایوان کے ارکان قرار دیئے جائیں۔ اسطرح علاوہ اس کے کہ مملکت ان اربابِ فکر و نظر کی ذہانت، صلاحیت اور تجربہ سے مستفید ہو سکیگی ایک اور منفعت بخش پہلو یہ بھی ہوگا کہ معاشرہ میں ان حضرات کو عزت کا مقام حاصل ہو جائیگا اور یہ معاش کیطرف سے بھی بے فکر ہو جائینگے۔ ذرا سوچئے کہ ایسے لوگ جن کے سینوں میں مملکت کے بلند ترین راز ہوں اگر ریٹائرمنٹ کے بعد گمنامی کے گوشے میں دھکیل دیئے جائیں یا انہیں ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے مختلف دروازوں پر دستکیں دینی پڑیں تو ان میں لغزش کے کتنے امکانات ابھر سکتے ہیں۔ عزت سے محرومی اور تنگ دستی بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔

انتخابی اصلاح کے ساتھ ہی اقتصادی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک سے "عزت الاثم" (FALSE PRESTIGE) کے فساد کو دور کیا جائے اور معاشرہ میں سادہ زندگی کو عام کیا جائے۔ اس کا مؤثر طریقہ نہ وعظ و نصیحت ہے نہ قوانین و ضوابط۔ اسکا طریقہ یہ ہے کہ سربراہانِ مملکت خود اس کا عملی نمونہ بن جائیں۔ قائداعظمؒ نے ایک ٹوپی سر پر رکھ لی تھی، سارے ملک کے سر سے ہیٹ اور طرّے دار پگڑیاں اتر گئیں اور جناح کیپ ایک قومی نشان بن گیا۔ اگر سربراہانِ مملکت ملیشیا پہن کر باہر نکل آئیں، بڑے بڑے محلات کی جگہ دو دو تین کمروں کے مکانوں میں رہائش اختیار کر لیں اور کھانے میں صرف ایک ڈش پر اکتفا کریں تو آپ دیکھئے کہ ملک ان کے اتباع میں کسقدر اقتصادی ہمواریوں کا آئینہ بن جاتا ہے۔ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ کو چھوڑیئے کہ لوگ انہیں مافوق البشر ہستیاں اور اس طرح ان کے اتباع کو ناممکن العمل قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں۔ ماؤزے تنگ اور کرنل ناصر کو دیکھئے، انہوں نے جو سادگی خود اختیار کی وہ قوم کا شعار بن گئی۔ یہی کچھ ہمارے ہاں بھی ہو سکتا ہے۔ ملیشیا پہنئے اور ہر قسم کے سامانِ زینت و تفنیش کی درآمد ممنوع قرار دے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ چند دنوں میں ملک کس طرح نہ صرف خود کفیل بلکہ دوسروں کی کفالت کی ذمہ داری بھی اپنے سر پر لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

مسٹر بھٹو کیلئے دو ایک مقام اور بھی سخت ابتلا کے ہیں۔ اُنکا اپنی اہمیت برقرار رکھنے کا تقاضا یہ ہو گا کہ وہ مرکز میں اپوزیشن میں رہیں لیکن ملک کی سالمیت کا تقاضا یہ ہو گا کہ وہ ملک گیر مفادات کی شرائط کیساتھ شریکِ حکومت رہیں۔ یہ سطور اس وقت لکھی جا رہی ہیں جب ہنوز صوبائی اسمبلیوں کیلئے انتخابات کا انعقاد نہیں ہوا لیکن امید غالب ہے کہ سندھ اور پنجاب میں انکی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس حکومت کے قیام کے بعد انہیں اس دشواری کا سامنا ضرور کرنا پڑیگا کہ عوام ان سے مطالبہ کرینگے کہ جو وعدے ان سے کئے گئے تھے انہیں پورا کیا جائے اور وہ یہ کہہ کر معذرت پیش نہیں کر سکینگے کہ مجھے ایسا کرنے کا اقتدار حاصل نہیں۔ اس دشواری سے بچنے کا طریقہ وہی ہے جو ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ معاشی انقلاب کا منتہیٰ متعین کیجئے اور پھر عوام کو فکری طور پر سمجھا دیجئے کہ اس منتہیٰ تک کسطرح آہستہ آہستہ بتدریج پہنچا جائیگا۔ اس کیلئے شرط یہ ہو گی کہ اس کیلئے جو مدارج مقرر کیجئے انہیں عملاً پورا بھی کرتے جائیے اور اپنے آپ کو شروع ہی سے نمونہ اُس منتہیٰ کا بنا لیجئے۔ یہی طریقِ نبوتؐ اور سنتِ رسول اللہؐ کا اتباع ہے۔ حضورؐ نے اس زمانے میں جب یہ نظام ہنوز عبوری ادوار میں سے گزر رہا تھا، اپنے لئے منتہیٰ کی منزل تجویز کر لی تھی ۔ سربراہِ مملکت ہونے کے باوجود ایسے حجروں میں قیام جن کی چھت کے ساتھ سر ٹکرا جاتا تھا، کپڑوں کا کوئی جوڑا ایسا نہ تھا جسے تہ کر کے رکھا گیا ہو، کھانا اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں پر مشتمل تھا، گھر میں زاید از ضرورت ایک پیسہ تک نہیں رکھا جاتا تھا۔ املاک اور جائیدادوں کا سوال تک نہ تھا۔ وفات کے بعد دو ہتھیاروں کے سوا کوئی ترکہ نہیں تھا۔ معاشرہ نے تو معلوم نہیں اس منزل تک کب پہنچنا تھا، سربراہِ مملکت نے اس منزل کو شروع ہی سے اپنی قرارگاہ بنا لیا تھا۔ صحیح انقلاب لانے کا یہی طریق ہوتا ہے۔

اسکے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ قوم کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ یہ تصورات انکا جزوِ حیات بن جائیں۔ اس کیلئے ضروری ہو گا کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ شرک آلود ثنویت کو ختم کر کے نظامِ تعلیم کو یکسر بدل دیا جائے اور اس کی جگہ ایسے نظام کو رائج کیا جائے جسکی رُو سے علومِ حاضرہ میں قرآنی اقدار کو یوں سمو دیا جائے کہ قوم کے یہ نوجوان حق و باطل میں تمیز کرنے کے اہل ہو جائیں اور ان اقدار کا تحفظ ان کے دل کا تقاضا بن جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا خیال بھی رکھا جائے کہ ملک کی عسکری طاقت میں کسی قسم کی کمزوری نہ آنے پائے کہ دشمن ہر وقت ہماری گھات میں ہے۔ نیز ملک کے اندر ان عناصر پر گہری نظر رکھی جائے جو ملک کیلئے کسی قسم کے بھی خطرہ تو ایک طرف ضعف تک کا بھی باعث بن سکتے ہوں۔ یہ عناصر اس وقت تک بے زمام رہے ہیں۔ ان کے مؤاخذہ کی سخت ضرورت ہے۔

———— (۰) ————

ان نتائج کے ضمن آئے ایک اور سمت سے بھی آگے کی طرف بڑھنے کا امکان روشن ہو گیا ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ امت میں مذہبی فرقوں یا مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود بنصِ صریحِ قرآن شرک ہے۔ اس سے امت کی وحدت جس پر دین کی بنیاد ہے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ہماری اس آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ شرک کے اس "ظلمِ عظیم" میں جماعتِ اسلامی سب سے آگے آگے تھی۔ اسکے امیر نے ۱۹۳۸ء میں (جب انہوں نے ہنوز اپنی الگ پارٹی نہیں بنائی تھی) لکھا تھا کہ امت میں کسی پارٹی کی تشکیل دین کے یکسر خلاف ہے۔ اسکے بعد انہوں نے اپنی پارٹی بنائی اور اس کا نام "جماعتِ اسلامی" رکھا ۔ پارٹی اور اسلامی!!

——— اور پھر پچھلے دنوں تو پارٹیاں برساتی مینڈکوں کی طرح ابھریں۔ اب نتائج کی رُو سے ملک میں عملاً صرف دو پارٹیاں باقی رہ گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی۔ یوں فطرت کے تھپیڑے نے قوم کا رُخ خود بخود وحدت کی طرف موڑ دیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اب اگر باقی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو اس سے ملک میں امن ہو جائیگا۔ اس کے بعد اگر قرآن آئینِ مملکت کی اساس قرار پا گیا تو پارٹیوں کا وجود ہی ختم ہو جائیگا اور باقی صرف امت رہ جائیگی۔

——— (٠) ———

اور آخر میں ایک بڑی اہم بات ——— گذشتہ کشمکش کے دوران مخالفین نے آپ لوگوں کی شخصیتوں پر بھی حملے کئے۔ اس سے انسان کے دل میں طبعًا انتقام کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے لیکن آپ اب اس بلند مقام پر ہیں کہ کسی سے ذاتی انتقام لینا آپ کو زیب نہیں دیگا مخالفینِ قریش نے مسلسل انیس بیس سال تک حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ اقدس اور آپکے اعزہ و اقربا کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ فتح مکہ کے بعد یہ تمام مخالفین قیدیوں کی حیثیت سے صف بستہ پا بجولاں حضورؐ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ کہو تم کس سلوک کے مستحق ہو۔ انہوں نے کہا کہ جس سلوک کے مستحق شکست خوردہ دشمن ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے نگاہ بلند کی اور انگلی کے ایک اشارے سے فرمایا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ آج شخصی انتقامات سب ختم ہو گئے۔ تم سب آزاد ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں مخالفین میں "اسلام پسندی" کے دعوے کے باوجود عہد جاہلیت کے کفار جیسا کیرکٹر بھی نہیں ہے۔ وہ اس شکست کے بعد پہلے سے بھی زیادہ پست اخلاقی سطح پر اتر آئے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود ہم فاتحین سے یہی کہیں گے کہ وہ عظمتِ کردار کا ثبوت ضرور دیں اور ذاتی انتقامات سے بلند ہو جائیں۔ البتہ جہاں مملکت کے نقصان کا کوئی شائبہ ہو اس کے سدِّباب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اس سے پہلے اربابِ اقتدار نے بالعموم شخصی انتقامات تو لئے لیکن مملکت کے تحفظ کے سلسلے میں خطرناک قوتوں کی طرف سے نہ صرف اغماض برتا بلکہ انہیں بڑھنے، پھولنے پھلنے کی بھی چھٹی دیدی جس سے ہمیں یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ یہ تو خیر منائیے پاکستان کی افواجِ قاہرہ کی، کہ انہوں نے جانیں دے کر مملکت کو زندگی عطا کر دی ورنہ ان قوتوں نے مملکت کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ہم پر تین مواقع بڑے ہی خطرناک آئے تھے ——— ایک تقسیم ملک کا ہنگامہ، دوسرا جنگِ ستمبر کا حادثہ اور تیسرا موجودہ انتخابات کا زلزلہ۔ اگر ان حادثات میں سے کسی ایک موقع پر بھی پاکستان دشمن قوتیں اپنے مشئوم عزائم میں کامیاب ہو جاتیں تو آج ہماری داستان تک بھی داستانوں میں نہ ہوتی۔ ان نازک ترین مراحل میں اس خطۂ زمین کے محفوظ رہنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فطرت نے اس سے کوئی اہم کام لینا ہے جس کے لئے اسکی یوں حفاظت کی جا رہی ہے۔ اور ظاہر ہے اس سے زیادہ اہم کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ خطۂ ارض، خدا کی ربوبیتِ عالمینی کا گہوارہ بنے اور اس کے بعد پوری زمین اس کے نشو و نما دینے والے نور سے جگمگا اٹھے۔ حالیہ انتخابات میں مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی کھلی ہوئی شکست اسی مثبت پروگرام کی منفیانہ تمہید نظر آتی ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است!

دھریرہ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء

——— (۰۰۰) ———

حقائق و عبر

۱۔ کیا قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے؟

سات ستمبر کے انتخابات کے موقع پر، ٹیلیویژن پر جو مسلسل پروگرام نشر ہوا۔ اس میں ایک مذاکرہ بھی مندرجہ بالا عنوان سے شامل تھا۔ مجلس مذاکرہ میں کراچی کے دو بزرگوار تھے، اور تیسرے صاحب ان کا درمیانی واسطہ، ان میں سے ایک صاحب نے تو یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ کہ قرآن کریم تلاوت کے لئے ہے۔ اسے ضابطہ وغیرہ نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے صاحب نے ان سے اختلاف تو کیا۔ لیکن جواب میں کوئی متعین اور واضح بات نہ کہی۔ لہٰذا موضوع نہ صرف مبہم رہ گیا۔ بلکہ ناظرین اور سامعین کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب بھی بن گیا۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی کہ ٹیلیویژن یا ریڈیو کے ارباب نظم و نسق کو جس میدان میں درک حاصل نہ ہو، وہ اسے اپنے پروگراموں میں شامل کیوں کر لیتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ عنوان میں لفظ "ضابطہ" کا مفہوم کیا ہے، ہمارے ہاں یہ لفظ ایک قانونی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ضابطہ فوجداری۔ ضابطہ دیوانی وغیرہ سے مراد ہوتا ہے، ایسا مجموعۂ قوانین جس میں متعلقہ قوانین اور ان کی تفاصیل اور جزئیات وغیرہ مندرج ہوں۔ قرآنِ کریم ان معنوں میں ضابطہ حیات نہیں۔

اگر ہم "ضابطہ" کے معنی ضبط یعنی کنٹرول میں رکھنے والا، کر لیں تو پھر بات واضح ہو جاتی ہے، اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ قرآنِ مجید انسانی زندگی کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ انہیں بیباک نہیں ہونے دیتا۔ مثلاً جنسی جذبہ انسانی زندگی کا تقاضہ ہے۔ اور قرآنِ کریم وہ حدود متعین کرتا ہے، جن کے اندر رہتے ہوئے، اس تقاضے کی تسکین کی جا سکتی ہے۔ یا مثلاً جلبِ منفعت انسانی زندگی کا تقاضہ ہے اور قرآنِ کریم وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے۔ جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اس تقاضے کو پورا کر سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بجز معدودے چند قوانین کے اسی قسم کے حدود اور اصول دیئے گئے ہیں۔ جو ضابطۂ حیات کا کام دیتے ہیں۔

اس میں ان ضوابط (یعنی حدود) کی جزئیات نہیں دی گئیں - ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق نظامِ ملت باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گا - یہ جزئیات بدلتی رہیں گی - لیکن قرآنی حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی -

اب رہا سوال اس ضابطہ کے مکمل ہونے کا - انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں - ایک اس کی طبیعی زندگی - اور دوسری وہ زندگی جسے سمجھنے کی خاطر آپ انسانی زندگی کہہ لیجئے - جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے، وہ جسم سے متعلق طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے - یہ میدان قرآن کریم کے احاطہ ہدایت سے باہر ہے، اگرچہ اس کے لئے بھی اس میں کہیں کہیں کوئی اشارہ مل جاتا ہے - قرآن کا حقیقی موضوع انسانی زندگی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اس زندگی کے جملہ تقاضوں کے متعلق اس میں ضوابط (حدود) موجود ہیں - اس اعتبار سے یہ ضابطہ حیات مکمل ہے - اللہ تعالیٰ نے اسی نہج سے قرآن کریم کو مکمل بھی کہا ہے - اور غیر متبدل بھی (وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللہِ) -

واضح رہے کہ قرآن کریم میں ضابطہ کا لفظ کہیں نہیں آیا -

۲ - بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی!

ہم نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کرنے والوں سے بار بار کہا تھا کہ وہ اس اصطلاح کی وضاحت فرمادیں - یعنی وہ واضح الفاظ میں یہ بتائیں - کہ سوشلزم کسے کہتے ہیں - اور وہ اسلامی سوشلزم سے کس طرح مختلف ہے - اس کا ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا - اور اسی بنا پر "اسلام پسند" حلقوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ ان کے خلاف مخالفت کا طوفان برپا کردیں - ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ ایک چیز ہے سوشلزم کا فلسفۂ حیات اور دوسری چیز ہے اس کا معاشی نظام، یہ معاشی نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے - لیکن اس کا فلسفہ حیات، اسلامی فلسفہ حیات کی نقیض ہے - لہٰذا مسترد کردینے کے قابل ہے - "اسلام پسند" طبقے جب سوشلزم کے اقتصادی نظام کو بھی اسلام کے خلاف قرار دیتے تھے - تو ہماری طرف سے ان کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا تھا - جس کے بعد انہیں کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی - لیکن اسلامی سوشلزم کے حامیوں کی طرف سے بات کی وضاحت پھر بھی نہیں ہوتی تھی - اب مسٹر بھٹو نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ:-

"میرے نزدیک سوشلزم اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے - البتہ کمیونزم اور مذہب میں تضاد یقینی طور پر موجود ہے - سوشلزم ظلم، ناانصافیوں،

استحصال اور غیر مساویانہ نظام سے پاک معاشرہ کی تعمیر کا علمبردار نظریہ ہے
اس کا نہ تو اسلام کی روح سے کوئی تصادم ہوتا ہے اور نہ ہی اسلام کے معاشی
یا اقتصادی نظریہ سے کوئی تضاد ہے۔ (مساوات ۱۵- دسمبر ۱۹۷۰ء)

جن لوگوں کو کمیونزم اور سوشلزم کے متعلق کوئی تھوڑی سی بھی واقفیت ہے، وہ جانتے ہیں، کہ ہمارے زمانے میں ان اصطلاحات کو مارکس، اینگلز اور لینن نے عام کیا۔ اسی نہج سے انہیں مارکسی اصطلاحات کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں "ازمز" اپنے فلسفہ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ اور وہ فلسفہ مذہب کی قدر ہے ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سوشلزم کا اقتصادی نظام کمیونزم کے نظام کی ابتدائی منزل ہے۔ اور کمیونزم کا اقتصادی نظام، سوشلزم کے اقتصادی نظام کی انتہائی منزل۔ ان دونوں میں فرق صرف اقتصادی نظام کے معتدل اور انتہائی ہونے کا فرق ہے، اور بس! — لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ کمیونزم مذہب کے خلاف ہے۔ اور سوشلزم مذہب کے خلاف نہیں۔ اس وقت روس اور چین دونوں میں سوشلزم کا نظام کارفرما ہے۔ کمیونزم کا نہیں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ روس اور چین دونوں مذہب کے سخت مخالف ہیں۔ یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ مارکسی کمیونزم ہی نہیں، سوشلزم بھی مذہب کے خلاف ہے۔ باقی رہی یہ دلیل کہ چونکہ سوشلزم ظلم، ناانصافی اور استحصال کے خلاف ہے، اور اسلام میں بھی ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے اس کا اسلام کی روح سے کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ تو کمیونزم، اقتصادی استحصال، اور ناانصافیوں کے بدرجہ غایت خلاف ہے، لہٰذا اسی دلیل کی بنا پر کمیونزم کو بھی اسلام کی روح کے خلاف قرار نہیں دیا جانا چاہیئے۔ پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے۔ کہ اگر سوشلزم، اسلام کے خلاف نہیں۔ تو پھر اس کے ساتھ لفظ "اسلامی" کے اضافہ کی ضرورت کیا تھی۔

آپ نے غور فرمایا۔ مسٹر بھٹو کی اسی وضاحت نے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اگر مسٹر بھٹو یوں کہہ دیتے کہ

> اسلام کا اقتصادی نظام اس کے اپنے منفرد فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر قائم ہے جو کمیونزم یا سوشلزم کے فلسفۂ حیات کی ضد ہے، لیکن چونکہ سوشلزم کا اقتصادی نظام اسلام کے اقتصادی نظام کے مماثل ہے۔ اس لئے ہم اس نظام کو "اسلامی سوشلزم" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسے سوشلزم کے فلسفۂ حیات سے کوئی تعلق نہیں —

اس سے بات واضح ہو جاتی۔ کیا ہم توقع کریں۔ کہ بھٹو صاحب مجوزہ آئین پاکستان میں اس کی وضاحت

کردیں گے! — اس سے وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ جن کے ازالہ کے لئے انہوں نے موجودہ وضاحت کی ضرورت محسوس کی ہے، لیکن جس وضاحت سے وہ غلط فہمیاں دور نہیں ہو سکیں —

۳- سیاسی دُور نگہی کی انتہا!

قارئین کو یاد ہوگا کہ مودودی صاحب نے اپنی ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کی طول طویل تقریر میں بڑی تعلی سے کہا تھا کہ ابھی ان کی عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی کہ انہوں نے اُس زمانے کی سیاسی تحریکوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بتادیا کہ ان تحریکوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے ہر تحریک کے متعلق اسی قسم کی پیش گوئی کی، اور ان کی ہر پیش گوئی حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہوئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، اس پر جماعت اسلامی کے نقیبار نے آسمان سر پر اٹھالیا کہ اس قسم کی سیاسی بصیرت رکھنے والا دنیا میں کوئی اور نہیں ملے گا!

مودودی صاحب نے اپنی آخری پیشگوئی ۷- دسمبر کے انتخابات سے ایک دن پہلے کی اور اس میں انہوں نے کہا:—

> انتخابات میں شکست سوشلسٹوں کا مقدر بن چکی ہے۔ جماعت اسلامی کے نمائندے انتخابات میں بڑی تعداد میں کامیاب ہوں گے۔ ماضی قریب میں جماعت اسلامی کی اہمیت اور مرکزیت میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات میں جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —

اور اگلے ہی دن انتخابات کے نتیجے نے اِس پیشگوئی کو جس طریق سے "سچا" ثابت کر دیا وہ اس مفکر اعظم کی سیاسی دور نگہی کا زندہ ثبوت ہے۔

لیکن ٹھہریئے! — اس کا جواب بھی خود مودودی صاحب کی زبان سے سن لیجئے۔ انہوں نے کہا تھا۔ کہ جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۸- دسمبر کو مرکزِ جماعت میں جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہم نے ان انتخابات کو اسلام اور سوشلزم کی جنگ قرار دیا تھا۔ اور فریقِ مخالف نے بھی اس چیلنج کو قبول کر کے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ تو اہل اسلام کی اس واضح شکست کے بعد اب ہمارے پاس اسلام کی حقانیت کا کیا ثبوت ہے تو اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:-

> یاد رکھئے! نہ اسلام ناکام ہوا ہے نہ اہل اسلام کو شکست ہوئی ہے بلکہ فی الحقیقت وہ لوگ ناکام ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے سوشلزم کے حق میں اپنی رائے دی ہے انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام ایسے گزرے

ہیں۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی رشد و ہدایت کی ترویج میں کھپا دی۔ لیکن ان کی قوم نے ان کی اس تبلیغ پر کان نہ دھرا۔ اور آخر کار ہلاک ہو کر رہ گئی۔ یعنی انبیاء علیہم السلام کا مشن اور ان کا پیغام ہدایت ناکام نہیں ہوا۔ بلکہ خود وہ قوم ناکام ہو گئی جس نے ان کے اس پیغام کو سننے اور ان کے اس مشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ناکامی حق کا مقدر نہیں ہے۔ خواہ بظاہر اس کی ناکامی کے آثار کتنے ہی نمایاں ہوں، اسی طرح کامیابی باطل کا مقدر نہیں ہے۔ خواہ بظاہر اس کی کامیابی کا کتنا ہی چرچا ہو۔ ہمارے پیش نظر یہ ہونا چاہیئے کہ ظاہری فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے جائیں ...... جماعت اسلامی محض ایک سیاسی جماعت نہیں۔ وہ ایک نظریاتی تحریک ہے۔ اور انتخابات اس کے کام کا صرف ایک حصہ ہیں۔ ہم نے نہ پہلے کبھی انتخابات پر انحصار کیا ہے۔ اور نہ آئندہ انتخابات پر انحصار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب کو یہ بھی کہنا چاہیئے تھا۔ کہ میں نے جو ابھی کل ہی انتخابات کو اسلام اور کفر کی جنگ اور ہار جیت کا معیار بتایا تھا۔ تو آپ لوگوں کی بھول ہے۔ کہ آپ نے اسے حقیقت پر محمول کر لیا۔ میرے الفاظ کے باطنی معانی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اور انہیں پہچاننے کے لئے بڑی دور رس نگاہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

معاصر "ایشیا" نے مودودی صاحب کا مندرجہ بالا جواب نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

اس جواب سے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے ۔ (ایشیا ۱۳۔ دسمبر ۷۰ء)

کیوں نہ کھل اٹھتے۔ وہ مرجھا اس لئے گئے تھے کہ انہیں خیال تھا۔ کہ اس ذلت آمیز شکست سے جماعت اسلامی ختم ہو جائے گی اور ۲۳ برس کا بنا بنایا روزگار چھوٹ جائے گا۔ مولانا نے اطمینان دلا دیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمارا مقصد ملک میں انتشار پیدا کئے رہنا ہے اور ہماری شکست سے اس انتشار کے لئے بڑے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے لئے رزق کی راہیں اور بھی کشادہ ہو گئی ہیں۔ ؎

"خدا" بہ حکمت بہ بندد درے ٭ کشاید ز فضل و کرم دیگرے

اور اس کشادِ رزق کے لئے مودودی صاحب نے اسی وقت ایک رڈا رکھ دیا جب کہا کہ:-

جماعت اسلامی سے زیادہ غریب اور بے وسیلہ جماعت کون سی ہے ۔۔۔؟

یعنی انہوں نے اپنے "متفقین" سے کہا کہ نظریہ پاکستان فنڈ کا ستر لاکھ روپیہ اور تمہاری آمدنیوں کا پچاس فیصد عطیہ جماعت کی غریبی اور بے کسی میں کچھ کمی نہیں کر سکا۔ آئندہ عید قربان پر بکروں کی کھالوں کے علاوہ تمہیں

اپنی کھالیں بھی اتار کر دینی ہوں گی۔

خود "الیشیا" نے ان انتخابات کے نتیجہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اداریہ سپرد قلم فرمایا ہے جس کا عنوان ہے۔

— یہ نتیجہ خلاف توقع نہیں —

یعنی مودودی صاحب ۷۔ دسمبر کو یہ فرماتے ہیں کہ انتخابات میں شکست سوشلسٹوں کا مقدر بن چکی ہے اور جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ حضرت یہ فرما رہے ہیں۔ کہ انتخابات کا نتیجہ خلاف توقع نہیں — اس کے بعد اداریہ میں لکھا ہے۔

اسلام کے بارے میں جو منافقت یہاں برتی گئی ہے وہ اپنے منطقی نتائج تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی آج سے پہلے جو لوگ بھی وسائل حکومت پر قابض رہے ہیں۔ انہوں نے سٹیجوں پر اسلام کا نام لیا لیکن عملی پالیسی میں اسلام کی جڑ کاٹی۔ اور پوری کوشش کی کہ اسلام کی راہ ہموار نہ ہونے پائے ظاہر ہے کہ منافقت کبھی ایمان کی راہ ہموار نہیں کرتی۔ بلکہ کفر اور لادینی کا زینہ بنتی ہے۔ انجام کار جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسمیں آج لادینی قومیت کو انتداب دے دیا گیا ہے۔

مودودی صاحب بھی تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کی ہر کامیابی پر اسی قسم کی گالیاں دیا کرتے تھے —

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب کو ۷ دسمبر تک اس منافقت کا پتہ نہ چل سکا۔ جو اسلام کے بارے میں یہاں برتی گئی تھی۔ اور جو اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی ؟

جن لوگوں کی حالت یہ ہو اُن سے کسی صورت میں بھی دیانت و صداقت تو ایک طرف، اپنی شکست کو شریفانہ انداز سے تسلیم کرنے کی جرأت کی توقع بھی کی جا سکتی ہے !

جماعت اسلامی یہ کہتی ہے۔ کہ یہاں اسلام کے بارے میں منافقت برتی گئی۔ اور ان کے برعکس "اسلام پسندوں" کے دوسرے رکن رکین احتشام الحق تھانوی فرماتے ہیں کہ:-

اسلامی نظریہ پاکستان کے تحفظ کے سلسلے میں سرکاری طور پر جس طرح کھل کر سرپرستی کی گئی۔ وہ بھی اسلام اور ملک کے حق میں بھرپور اور مؤثر کوشش کرنے (کے سلسلے میں) کچھ کام نہ آ سکی ..... اور انہوں نے ساری دنیا میں یہ سوا کن تاثر پیدا کر دیا کہ اسلام کے ملک میں اسلام ہار گیا —

(حریت کراچی مورخہ ۱۰ دسمبر ——

—— بحوالہ لیل و نہار ۱۶ تا ۲۰ دسمبر)

تعارفی ارشادات

(پرویز صاحب نے طلوع اسلام کی سابقہ کنونشن میں، "قدیم وجدید کی کشمکش" کے عنوان سے جو خطاب پیش کیا تھا اسے اشاعتِ حاضرہ میں شائع کیا جارہا ہے جس نشست میں یہ خطاب سامنے آیا تھا اس کی صدارت محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے فرمائی تھی۔ انہوں نے خطاب سے پہلے چند الفاظ بطور تعارف ارشاد فرمائے تھے۔ چونکہ وہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں اس سے پہلے چھپ چکا تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ تعارف اس میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے ہم الگ پیش خدمت کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام)

(۱)

محترم پرویز صاحب کے آج کے موضوع کا مرکزی نقطہ (PERMANENCE) اور (CHANGE) کا امتزاج ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں۔ محترم پرویز صاحب ہمیشہ سے اس نقطہ پر زور دیتے چلے آرہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (PERMANENCE) اور (CHANGE) کا امتزاج کائنات کے ہر گوشے میں کارفرما ہے۔ ہر جگہ کچھ مستقل اصول ہیں جن کی (APPLICATION) اور جزئیات حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔ خود زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ کچھ (FUNDAMENTALS) ہیں جن کے مجموعے کا نام زندگی ہے۔ جہاں زندگی ہوگی وہاں خوراک کا حصول ہوگا۔ سائنس کی زبان میں اسے (NUTRITION) کہتے ہیں۔ دوسرا آکسیجن کا حصول اور اس کے ذریعے حصول شدہ خوراک کا نئی کیمیائی تراکیب میں بدلنا۔ اسے ہم (RESPIRATION) یا سانس لینا کہتے ہیں۔ تیسرا حاصل شدہ خوراک کے ذریعے زندہ شے کی جسامت کا بڑھنا، جسے (GROWTH) کہتے ہیں اور نئی کیمیائی تراکیب سے نئی خصوصیات کا پیدا ہونا جسے (DEVELOPMENT) کہتے ہیں۔ چوتھا، زندہ شے کے جسم کا کوئی حصہ اگر ضائع ہو جائے تو اس کی جگہ نئے حصے کی تعمیر، اسے (SELF-REPAIR) کہتے ہیں۔ پانچواں، زندہ شے کا اپنی مثل نئی اشیا بنانا جسے (REPRODUCTION) کہتے ہیں۔ چھٹا، زندہ شے کا بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی ساخت میں تبدیلی کرتے جانا۔ اسے (ADAPTATION) کہتے ہیں۔

زندگی کے یہ چھ (FUNDAMENTALS) ہیں جن کی (APPLICATION) اور جزئیات بے حد مختلف

اور وسیع ہیں۔ پانی کے اندر جاندار اشیاء کے حصولِ خوراک کے طریقے اور، اور خشکی پر اور۔ خشکی پر شیر کا طریق اور، بکری کا طریق اور، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح نچلے درجے کی زندہ اشیاء ایسی بھی ہیں جو آکسیجن بغیر ہوا کے حاصل کرتی ہیں۔ اوپر کے درجے کے جاندار آکسیجن ہوا سے حاصل کرتے ہیں لیکن سانس لینے کے طریقے ہر جگہ مختلف ہیں۔ اگر درخت کی شاخ کاٹ دی جائے تو اس کی جگہ نئی شاخ اُگ آئیگی۔ اگر کیچوے کے جسم کو کاٹ کر دو حصے کر دیئے جائیں تو ہر حصہ نیا جانور بن جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان کی انگلی کاٹ دی جائے تو نئی انگلی اس کی جگہ پیدا نہیں ہوگی۔ صرف زخم مندمل ہو جائیگا۔ (SELF - REPAIR) کی مختلف قسمیں ہیں۔ (GROWTH & DEVELOPMENT) (نشوونما) کی حد ہر جاندار کے اندر مختلف ہے۔ چیونٹی کی اور، ہاتھی کی اور، وغیرہ وغیرہ —— (REPRODUCTION) کہیں انڈوں کے ذریعے ہے کہیں بچوں کے ذریعے۔ کہیں رحمِ مادر سے باہر ہے اور کہیں اندر۔

اگر زندگی کے باقی لوازمات قائم ہوں لیکن ایک جاندار شے چھٹے (FUNDAMENTAL) سے محروم ہے یعنی بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو (ADAPT) نہیں کر سکتی تو اس کی نوع (EXTINCT) یعنی دنیا سے ناپید ہو جائے گی، چاہے دو نسلوں کے بعد ہو، چاہے چار کے بعد۔ اس کی بقا اور ارتقا صرف اسی صورت میں جاری رہے گی کہ پورے کے پورے چھ (FUNDAMENTALS) پر عمل ہوتا ہے۔

بعینہٖ یہی اصول انسانی دنیا میں کارفرما ہے۔ یہاں (FUNDAMENTALS) انسانوں کو وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور ان (FUNDAMENTALS) کی (APPLICATION) اور جزئیات بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔ جو قوم وحی کے عطا کردہ (FUNDAMENTALS) پر قائم ہے اور اس کے ساتھ اپنے اندر (ADAPTATION) کی صلاحیت رکھتی ہے، اس کی بقا اور ارتقا جاری رہے گی۔ جو (FUNDAMENTALS) سے منہ موڑ لے گی یا (ADAPTATION) کی صلاحیت سے عاری ہوگی وہ زود یا بدیر (EXTINCT) ہو جائے گی۔

محترم پرویز صاحب کی ساری زندگی کی سعی و کاوش کا منتہٰی یہ ہے کہ انسانیت کو بالعموم اور مسلمان قوم کو بالخصوص (EXTINCTION) سے بچایا جائے۔

—— (باقی) ——

باسمہٖ تعالیٰ

قدیم اور جدید میں کشمکش

(کیا قانون شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟)

طلوع اسلام کنونشن، منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں

پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قدیم اور جدید میں کشمکش

کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

پرویز

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

قوموں کی زندگی میں عبوری دور بڑا ہی نازک، کشمکش انگیز، اضطراب خیز، شورش آمیز، محرومِ سکون و بہجور طمانیت، اور اکثر و بیشتر یاس پرور اور صبر رُبا ہوتا ہے۔ "عبوری دور" سے مراد ہوتا ہے وہ زمانہ جس میں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے، اور جو کچھ ہونا چاہیئے وہ ہنوز محسوس و مرتب شکل میں سامنے نہ آیا ہو۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی تصویر جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر رلکے (RILKE) نے ان حقیقت نگار الفاظ میں، مؤثر ترین انداز سے پیش کی ہے کہ

> Each torpid turn of the world has such
> disinherited children,
> to whom, no longer what has been, and not
> yet what is coming, belongs.

یعنی تاریخ کی گذرگاہوں پر ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں زمانے کی حرکت کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جاتی ہے۔ وہاں ہمیں ایسے محروم الارث بچے نظر آتے ہیں جن کی حرماں نصیبی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جو کچھ متواتر چلا آرہا تھا وہ ان سے چھن چکا ہوتا ہے، اور جس نے اس کی جگہ لینی تھی، وہ ہنوز ضمیرِ روزگار میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور آب و تاب سے موزوں ہو کر سامنے نہیں آیا ہوتا — یہ سامان سوختہ اور متاع بردہ جنم نسل، بیم و رجا کے ان دوراہوں

پر عجیب کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔

ہماری موجودہ نسل پاکستان کی موجودہ تعلیم یافتہ نسل اسی کشمکش میں مبتلا ہے اور بُری طرح مبتلا۔ چنانچہ جن گھرانوں کا ماضی مذہبی روایات کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے، ان میں اکثر و بیشتر اس قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی!

ہم سرکش نہیں ہونا چاہتے۔ ہم تہذیب و اخلاق کی حدود شکنی پسند نہیں کرتے۔ ہم شرافت و نجابت کی انسانیت ساز زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن چچا جان! آپ سوچئے تو سہی کہ ہم سے مطالبہ کیا کیا جا رہا ہے؟ دنیا ہزاروں سال آگے بڑھ چکی ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ زیست کے انداز بدل چکے ہیں۔ تمدن و معاشرت کی روشیں بدل چکی ہیں۔ زندگی کا ہر نظام — سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، ملی، بین الاقوامی، ایک ایک کر کے نئے قالبوں میں ڈھل چکے ہیں۔ فکر کی فرسودہ راہیں پامال ہو چکی ہیں۔ سوچ کے طور طریق بدل چکے ہیں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں تبدیلی آ چکی ہے۔ لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کہ تم اسی انداز کی زندگی بسر کئے جاؤ جس انداز کی زندگی آج سے ہزار سال پہلے بسر کی جاتی تھی۔ تم اپنے اوپر انہی پابندیوں کو عاید کرو جو پابندیاں صدیوں پہلے کے انسانوں پر عاید کی گئی تھیں۔ تم سوچو تو انہی کے دماغ سے، سمجھو تو انہی کے دل سے، دیکھو تو انہی کی آنکھوں سے، سنو تو انہی کے کانوں سے۔ تم انہی کے متعین کردہ راستوں پر چلتے رہو، انہی کی وضع اور اختیار کردہ روشوں پر گامزن رہو۔ تم ہر نظریہ کو انہی کے پیمانوں سے ماپو، ہر عقیدہ کو انہی کی کسوٹی پر پرکھو۔ جسے وہ غلط کہہ چکے ہیں، اسے غلط کہو۔ جسے انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اسے صحیح سمجھو — یہ ہے جو ہم سے کہا جا رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم سے کہا یہ جا رہا ہے کہ اگرچہ تم بیس چوبیس سال کے جوان ہو چکے ہو لیکن تمہیں وہی جوتا پہننا پڑے گا جو تمہیں دس سال پہلے بنوا کر دیا تھا کیونکہ وہ جفت ساز اپنے زمانے کا بہترین کاریگر تھا۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس دس سال کے عرصے میں ہمارے پاؤں کتنے ہی بڑھ گئے ہیں اور جوتا اتنے کا اتنا ہی ہے، اس لئے اب وہ فِٹ نہیں بیٹھتا تو ہمیں کوسا جاتا ہے کہ تم بدتمیز ہو گئے ہو، گستاخ ہو گئے ہو۔ بڑوں کے سامنے بولتے ہو، بزرگوں کا ادب احترام نہیں کرتے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم اس کا کیا جواب دیں! ہمیں یہ خود ہی علامہ اقبالؒ کے یہ شعر سناتے رہتے ہیں کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

لیکن جب ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ ابا جان! زمانے کے انداز بدلے جا چکے ہیں' اسلئے ہمیں بھی اپنے آئین وضوابط میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں تاکہ یہ' زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکیں تو ہمیں ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ زمانے کے حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں اور اس کے تقاضے کچھ کے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائیں' یہ آئین وضوابط ایسے ہی رہیں گے اور ان کی پابندی اسی طرح کرنی ہوگی۔ یہ شریعت کے احکام ہیں جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ ہمارے اسلاف کے فیصلے ہیں جو تم سے زیادہ سمجھدار تھے اور زمانے کے تقاضوں کو تم سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ اور پھر وہ بزرگ' تقویٰ اور پرہیزگاری میں اس مقام پر تھے کہ جس کی گرد کو بھی تمہارا زمانہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہم ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی سوء ادبی ہے۔ یہ زمانہ ہی گستاخوں اور بے ادبوں کا آ گیا ہے۔

اور جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی فرمایئے' چچا جان! کہ اس کے بعد کچھ عرض کرنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

گھروں کے اندر تو بات یہیں تک پہنچ پاتی ہے' لیکن جب یہ موضوع محراب ومنبر سے چھڑتا ہے تو جس قدر شکن آلود پیشانیوں، قہر آمیز نگاہوں اور کف بردہاں سیلابوں کے ساتھ قوم کے نوجوانوں کو ہدف طعن وتشنیع اور نشانۂ سب وشتم بنایا جاتا ہے' اور جس جس قسم کے کفر والحاد کے جگر پاش فتووں اور بے دینی وبے حیائی کے نفرت انگیز القابوں سے انہیں نوازا جاتا ہے، اس سے کون سا کان ناآشنا' اور کون سا قلب نامانوس ہے۔ اور اس کے ردعمل میں' جب یہ نوجوان کافی ہاؤسوں میں اس سوال کو موضوع گفتگو بناتے ہیں' تو پھر کونسی پھبتی ہے جو قدامت پسندوں کے خلاف کسی نہیں جاتی' اور کونسا فقرہ ہے جو مذہب پرستوں پر چسپت نہیں کیا جاتا۔

قوم کی کشتی، افراط وتفریط کے اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ دریا کی تلاطم خیزیاں، لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کے تھپیڑوں سے کشتی روز بہ روز کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ناخدا جن کے ذمے اس کی حفاظت وسلامتی تھی' اسے بھنور میں چھوڑ کر' لب ساحل آرمیدہ ہیں اور نہایت ذوق وشوق اور جذب وانہماک سے اس کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آیئے' فرصت کے ان چند لمحات میں ہم دیکھیں کہ اس کشمکش کی حقیقی وجہ کیا ہے اور اس کشاکش کا حل کیا؟

پہلے ہم ان نوجوانوں کو لیتے ہیں کہ انہیں سنبھالنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر ہمارے یہ نوجوان،

اَن پڑھ قسم کے حامی ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ایک بچہ بیس سال کا چھوڑ چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر سال کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اس کی شکل و شباہت، قد و قامت، وضع قطع، بود و ماند، حتیٰ کہ اس کی ذہنیت و قابلیت، اس کے امیال و عواطف، اس کے رجحانات و میلانات، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر عنصر میں تبدیلی آجائے گی، لیکن ایک حقیقت ایسی ہوگی جس پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس کی زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک اٹل اور غیر متبدل رہے گی۔ یعنی یہ کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اس حقیقت کو نہ وہ بدل سکتا ہے، نہ زمانے کے تقاضے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ان نوجوانوں کا دعویٰ صحیح نہیں کہ زمانے کے بدلنے سے ہر شے میں تبدیلی آجانی چاہیئے۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

تعلیم یافتہ طبقہ

لیکن چونکہ ہمارا یہ نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ ہے اس لئے ہم ان سے، ان کی ذہنی سطح پر، ان کی زبان میں گفتگو کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ زمانے کے بدلنے والے تقاضے بجا اور درست، لیکن کیا زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی نہیں جن پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ اٹل اور محکم رہتی ہیں۔ کیا سائنس کے بنیادی قوانین زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟ کیا جیومیٹری کی (PROPOSITIONS) آج بھی وہی نہیں جو آج سے تین ہزار سال پہلے تھیں، جب وہ دریافت ہوئی تھیں۔ کیا ریاضی اور الجبرا کے اساسی اصول، ازازل تا ابد، غیر متبدل نہیں رہتے۔ کیا حساب کا یہ ابتدائی سا گُر کہ دو طاق عددوں (ODD NUMBERS) کی حاصل جمع ہمیشہ جفت (EVEN) ہوتی ہے، کسی حالت اور کسی زمانے میں بھی قابلِ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے؟ لہٰذا، یہ مطالبہ کہ زمانے کے حالات کے بدل جانے سے ہر شے میں تبدیلی پیدا کر لینی چاہیئے، دنیائے علم و حقائق میں قابلِ تسلیم قرار نہیں پا سکتا۔ زمانے کے تقاضے لاکھ بدلیں، ناقابلِ تغیر حقیقتیں ہمیشہ ناقابلِ تغیر رہیں گی۔

قدامت پرست طبقہ

اور دوسری طرف ہم اپنے قدامت پرست بزرگوں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ زندگی کی بقاء کے لئے غذا کی ضرورت لا ینفک ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں نہ نوعِ انسانی کی پوری تاریخ میں کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں اس میں استثناء پایا گیا ہے۔ یہ زندگی کا غیر متبدل قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور فرمائیے کہ یہ تفاصیل کہ آپ کس قسم کی غذا کھاتے ہیں، کس طریق سے کھاتے ہیں، کن کن اوقات میں کھاتے ہیں،

ایسی ہیں جن میں ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں ان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آپ کی بچپن کے زمانے کی غذا اور تھی، جوانی کی اور، اور بڑھاپے کی ان دونوں سے مختلف۔ تندرستی کے زمانے میں غذا اور ہوتی ہے، بیماری کے دنوں میں اور۔ سردی میں اور قسم کی غذا کھانی پڑتی ہے گرمی میں اور قسم کی۔ کلیہ غیر متبدل ہے لیکن اس کی عملی جزئیات میں حالات کے بدلنے سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کیا کیا چیزیں غیر متبدل ہوتی ہیں اور کونسی ایسی جن میں حالات کے مطابق تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ یہ سوال صرف اس لئے اہم نہیں کہ اس سے ہماری قدیم اور جدید نسل میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی اہمیت کی اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ وجہ بنیادی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس مطالبہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ لیکن اس کے باوجود اس تئیس سال کے عرصہ میں ان قوانین کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک عملی قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک یہ بنیادی سوال طے نہیں پا سکا کہ اسلامی قانون کہتے کسے ہیں۔ اس میں کون کون سے اجزاء غیر متبدل ہیں اور کون کون سے ایسے جن میں بہ تغیر حالات تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

پاکستان میں بنیادی سوال

منیر کمیٹی میں یہ سوال اٹھایا گیا تو علماء حضرات نے کہا کہ اسلام میں مکمل ضابطہ قوانین پہلے سے موجود ہے جس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی تبدیلی کی اجازت۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس ضابطہ قوانین کو من و عن نافذ کر دے اور اگر کسی مسئلہ کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑے تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ دوسری طرف ارباب بست و کشاد جن کے سر پر ملکی قوانین کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، یہ محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر علماء کے پیش کردہ ضابطہ قوانین کو من و عن نافذ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ان کی کمزوری تھی یا تقاضائے مصلحت کہ وہ جس حقیقت کو محسوس کرتے تھے اُسے کھلے کھلے الفاظ میں زبان پر نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اس دوران میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں، ہر ایک نے اسی میں عافیت سمجھی کہ دستور میں تو یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک کے قوانین اسلامی ـــ یعنی کتاب و سنت کے مطابق ـــ ہونگے لیکن اس سے آگے کسی نے ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ یہ سوال کسی نہ کسی طرح ٹلتا چلا جائے۔ دوسری طرف علماء حضرات بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں تو ایک طرف دنیائے اسلام میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا ضابطہ قوانین موجود نہیں جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرتے ہوں۔ نہ ہی فرقوں

کی موجودگی میں ایسا ضابطہ، قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ بھی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ سوال عملاً سامنے آتے ہی نہیں۔ میرا تعلق، برادرانِ عزیز! نہ اربابِ حکومت سے ہے نہ ابنائے شریعت سے ــــ اقبالؒ کے الفاظ میں "میں ـــــ نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند" ـــ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور میرا مسلک یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آئے، قرآن کی بارگاہ سے پوچھوں کہ اس کا حل کیا ہے۔ قرآنِ کریم پر غور و تدبر سے، اس اہم ترین، اور (بظاہر) مشکل ترین مسئلہ کا جو حل میری بصیرت کے مطابق مجھے مل سکا ہے، اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت ہماری قوم اس (MOOD) ہی میں نہیں کہ کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر سکے۔ اس کے باوجود میں اس سوال کو سامنے لا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید اس کے بعد ہمارا نصیبہ یاوری کرے اور قوم اس قسم کے بنیادی مسائلِ حیات پر غور و فکر کی ضرورت محسوس کرے، تو میری قرآنی فکر کے یہ نتائج اس کے کسی کام آسکیں ـــ ورنہ اس وقت تو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

ـــــــ (٭) ـــــــ

آسمانی راہ نمائی

انسان کو جب اس دنیا میں بسایا گیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ زندگی کے جملہ مسائل کا اطمینان بخش حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے، تمہیں آسمانی راہ نمائی ملتی رہے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (۲/۳۸)۔ جو اس راہ نمائی کا اتباع کرے گا وہ بلا خوف و خطر، اور بے حزن و ملال منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس راہ نمائی کے لئے پروگرام تو یہی تھا کہ زندگی کے بنیادی اور غیر متبدل اصول و اقدار کو وحی کی رُو سے دیا جائے، اور اس بات کو ہر دور کے انسانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی طریق کار خود وضع کریں۔ لیکن شروع شروع میں انسانی عقل و شعور خام اور اس کا تجربہ ناپختہ تھا، اس لئے ان اصولوں کی بیشتر جزئیات بھی خود وحی کی رُو سے متعین کر دی جاتی تھیں۔ مثلاً جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وہ آنے والے سیلاب سے محفوظ رہنے کے لئے کشتی بنائیں، تو کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کی رُو سے بتایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۱۱/۳۷) "تم ہماری زیرِ نگرانی، ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ"۔ اس طرح ایک رسول غیر متبدل اصول و ضوابط اور اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق جزئیات و تفاصیل اپنی امت کو دے کر چلا جاتا۔ لیکن اس کے دنیا سے

چلے جانے کے بعد ہوتا یہ کہ اس کے نام لیوا مذہبی پیشوا "اپنی مفاد پرستیوں کے لئے" اس کی وحی میں اپنے خیالات کی آمیزش کر دیتے اور کہیں وہ دست بردِ زمانہ سے ویسے ہی تلف ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا اور ایک جدید ضابطۂ حیات بذریعہ وحی دے دیتا۔ اس میں غیر متبدل اصول تو وہی ہوتے جو سابقہ رسول کی وحی میں تھے لیکن جزئی احکام کا از سرِ نو جائزہ لیا جاتا۔ ان میں جو احکام ایسے ہوتے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور عند الضرورت ان میں اضافہ بھی کر دیا جاتا۔ یہی وہ نظامِ وحی ہے جسے قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ـــ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶)۔ جو (سابقہ) حکم ہم منسوخ کر دیتے تھے اس کی جگہ اس سے بہتر حکم نازل کر دیتے تھے۔ اور جو احکام ایسے تھے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی لیکن انہیں فراموش کر دیا گیا تھا ان کی دوبارہ تجدید کر دی جاتی تھی ـــ دوسرے مقام پر اسے "تبدیلیٔ احکام" کے پروگرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱۶/۱۰۱)

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ تاریخِ انسانیت میں اس دور کا آغاز ہو گیا جس میں ذہنِ انسانی نے بلوغت تک پہنچ جانا تھا۔ اس کی علمی اور فکری صلاحیتوں میں پختگی آجانی تھی۔ اس کے تجربہ اور مشاہدہ کے میدان افق تا افق پھیلتے چلے جانے تھے۔ تو اس وقت نوعِ انسان کو وحی کی رو سے آخری ضابطۂ حیات عطا کیا گیا جسے قرآنِ کریم کہا جاتا ہے۔

آخری ضابطۂ حیات

اس میں کچھ تو جزئی احکام تھے اور باقی زندگی سے متعلق وہ ابدی اصول و اقدار جو شروع سے غیر متبدل چلے آتے تھے اور جنہیں قوانینِ کائنات کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا۔ انہی اصولوں کے متعلق کہا گیا کہ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ .... (۴۲/۱۳)۔ تمہارے لئے بھی وہی الدین ـــ ضابطۂ حیات ـــ تجویز کیا گیا ہے جو ضابطۂ حیات انبیائے سابقہ ـــ مثلاً نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کی طرف وحی کیا گیا تھا۔ ان سے بھی ہم نے یہی کہا تھا ـــ اور تمہیں بھی اسی کی تاکید کی جاتی ہے ـــ کہ اس ضابطۂ حیات میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ پیدا نہ کرنا ـــ اس لئے کہ زندگی کے اساسی قوانین و اقدار میں اختلاف یا تفرقہ نظامِ حیات کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ یہی وہ الدین ـــ غیر متبدل اصولِ حیات کا ضابطہ ـــ تھا جس کا مہیمن (محفوظ ریکارڈ) قرآنِ کریم تھا (۱۵/۹)۔ ان کے علاوہ، جو کچھ اقوامِ سابقہ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا وہ احکامِ شریعت

تھے جو قابلِ تغیر و تبدل تھے۔ انہی کے متعلق کہا تھا کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (۵/۴۸)

اہلِ کتاب کا اعتراض

سابقہ مذاہب کے پیرو (اہلِ کتاب) چونکہ ان احکام کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھتے تھے، اس لئے وہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ دین جسے رسول اللہ پیش کرتے ہیں، وہی ہے جو انبیائے سابقہ کو دیا گیا تھا، تو قرآن کے بعض احکام ان کے ہاں کے احکام سے مختلف کیوں ہیں؟ اُن سے کہا گیا کہ اوّل تو تم نے اپنے رسول کے عطا کردہ ضابطۂ ہدایت میں تحریف کر دی اور دوسرے یہ کہ اُن جزئی احکام میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ الدّین ناقابلِ تغیر اصولوں کا نام ہے۔ انکے متعلق کسی قسم کا تنازعہ نہیں کیا جا سکتا۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲/۶۷)۔ اس سے واضح ہے کہ الامر غیر متبدل اصولِ دین ہے اور بدلتے رہنے والے احکام، مناسک و مناہج۔ انہی اصولوں کو جو آخری مرتبہ قرآن میں دیئے گئے تھے، مکمل بھی کہا گیا اور غیر متبدل بھی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهِ (۶/۱۱۵)۔ تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہیں قرآنِ کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ بابِ نبوت ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

قرآنِ کریم کا یہ حصہ دین کے اصولوں سے متعلق ہے۔ جہاں تک اُن احکام کا تعلق ہے جو اس میں مذکور ہیں، وہ بھی کم و بیش اصولی نوعیت کے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر حکم خاص شرائط سے مشروط ہوتا ہے اور اسے خاص حالات کے تحت نافذ کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا گیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہونگے۔ (مثلاً) اس میں سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن سرقہ کی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ اس نے اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطراری کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔ اس نے ان کا تعین انسانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ احوال و ظروف بدلتے رہتے ہیں، نہ ہی شرائط غیر متبدل ہو سکتی ہیں۔

یہی الدّین ہے

یہ ہیں وہ اصول و اقدار اور احکام و ضوابط جو قرآن میں مذکور ہیں۔ انہی کے مجموعہ کا نام "الدّین" ہے۔ جن امور کے متعلق قرآن خاموش ہے، ظاہر ہے کہ

ان کا تعلق دین سے نہیں۔ ان کے متعلق اس نے مسلمانوں سے تاکیداً کہہ دیا کہ ان کی بابت خواہ مخواہ کریدمت کرو۔ اگر ان کا تعلق دین سے ہوتا تو انہیں ہم خود ہی بتا دیتے۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ۔ اے جماعت مومنین! جن امور کے متعلق زبانِ وحی خاموش رہی ہے ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات مت کرو۔ ابھی نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ تمہارے سوالات کے جواب میں اگر وحی کی رُو سے کچھ مزید احکام دے دیئے گئے تو وہ تمہیں ناگوار گزریں گے۔ سو تم مفت میں بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ۔ (۵:۱۰۱) تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عاید کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش رہی ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ہم دانستہ خاموش رہے ہیں کہ ان امور کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے ان کے سلسلہ میں کوئی پابندیاں نہیں لگائی گئیں۔ اس آیہ جلیلہ کی تشریح حضور نبی اکرم نے ایک حدیث میں یوں فرمائی ہے کہ۔ اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْهَا۔ وَ حَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا۔ وَ حَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَ سَكَتَ عَنْ اَشْیَآءَ مِنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔ اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کریدمت کرو۔ یاد رکھو! جن باتوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے، اس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ (معاذ اللہ) بھول گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

حاصلِ بحث

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد انسانی راہ نمائی کی صورت یہ قرار پائی کہ

(۱) جن امور کے متعلق قرآن کریم نے اصولی راہ نمائی دی ہے، جماعتِ مومنین یعنی اسلامی مملکت امت کے مشورہ سے، اپنے حالات کے مطابق، یہ خود طے کرے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔

(۲) جہاں تک احکامِ قرآنی کا تعلق ہے، اسلامی مملکت ان مواقع، حالات اور شرائط کا تعین

کرے جن کے مطابق انہیں نافذ کیا جائے گا۔

(۳) اسلامی مملکت اس امر کا بھی فیصلہ کرے کہ قوم کے موجودہ حالات کیا ہیں اور قرآنی اصول و احکام کو کس طرح نافذ کیا جائے کہ وہ بتدریج، آہستہ آہستہ آخری منزل تک پہنچ جائے۔ یعنی نصب العین تو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچنے کے لئے عملی پروگرام حالات کے تقاضے کے مطابق خود وضع کرے۔ کسی قوم کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے، اصولِ تدریج و امہال کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی نزولِ وحی میں

اصولِ تدریج اس اصول کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کہ

> پہلے مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے (یعنی ترغیب و ترہیب سے متعلق آیات)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے، تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب نہ پینے کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتدا ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے بھی انکار کر دیتے۔
>
> (بخاری باب تالیف القرآن)

(زنا سے غالباً مراد ہیں نکاح کے وہ طریقے جو عربوں کے ہاں رائج تھے، لیکن جنہیں قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا تھا)۔ امتناعِ شراب کے احکام میں جس تدریج کو ملحوظ رکھا گیا وہ اربابِ فکر و نظر کے لئے بڑی بصیرت افروز ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی گھٹی میں شراب پڑ چکی ہو، جو نسلاً بعد نسلٍ اس کی عادی چلی آ رہی ہو۔ کیف و مستی جس کے خون کے ذرات میں حلول کر چکے ہوں، اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ یک لخت شراب چھوڑ دے۔ وہ اسے بتدریج ہی چھوڑ سکے گی۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر قرآن کریم میں پہلے یہ آیا کہ خمر و میسرہ میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن ان کے نقصان، ان کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ (۲/۲۱۹) پھر یہ کہا گیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴/۴۳)۔ نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہوا کرو۔ اور اس کے بعد تیسری منزل میں، اس کی قطعی ممانعت کی گئی (۵/۹۰-۹۱)۔ یہ ممانعت مدینہ میں آکر ہوئی۔ اسی طرح قرآنِ کریم کے دیگر احکام پر نگاہ ڈالئے۔ نظر آ جائے گا کہ اس نے اپنی اولین مخاطب قوم کی معاشرتی اور تمدنی سطح، اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو سامنے رکھ کر، ان احکام کو اس طرح بتدریج نازل کیا کہ وہ قوم تیئس سال کے عرصہ میں، اس پروگرام کے نقطۂ اولین سے آہستہ آہستہ آخری منزل تک لے جائی گئی جن سطحِ بین نگاہوں کے سامنے یہ بنیادی حقیقت نہیں، انہیں

قرآنی احکام میں جا بجا تضاد نظر آنے لگا۔ حالانکہ قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲)۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بہت سے اختلاف پاتے۔ تضادات کے اسی غلط

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

تصور نے یہ عقیدہ وضع کرا دیا کہ قرآن کی بعض آیات، دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ایک ایک نقطہ اپنے مقام پر اٹل ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ ناسخ و منسوخ کا تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ اس کے احکام احوال و ظروف سے مشروط ہیں اور ان کا اطلاق موقع اور محل کے مطابق ہوتا ہے۔ تدبر فی القرآن سے مراد یہ ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے جو حالات اس وقت ہیں، ان میں قرآن کا کونسا حکم نافذ العمل ہونا چاہیئے اور کون کون سی شرائط سے مشروط اور کس کس قسم کی قیود سے مقید۔ یہ شرائط و قیود قرآن کریم کی اصولی راہ نمائی کی روشنی میں حالات کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ یہ کام اسلامی مملکت کے کرنے کا ہے۔

(۰)

قرآنی راہ نمائی کے مطابق سب سے پہلی مملکت، نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ کو

پہلی اسلامی مملکت

حکم دیا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۸) معاملات میں افراد امت (اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن کریم کے احکام اور اصول اقدار سب منزل من اللہ تھے۔ ان میں خود رسول اللہؐ کے ذاتی خیالات و افکار کا بھی کوئی دخل نہیں تھا چہ جائیکہ اس سلسلہ میں دوسروں سے مشورہ لیا جاتا۔ جو کچھ مشاورت سے طے کیا جاتا مقصود کفادہ یہی تھا کہ جو حالات اس وقت درپیش ہیں، ان کی روشنی میں، قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کس قسم کے جزئی ضوابط مرتب کئے جائیں، اور جو احکام قرآن میں آئے ہیں، انہیں کون سی شرائط و حدود کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ ان امور کے فیصلے باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ اور (ظاہر ہے کہ) ان فیصلوں میں حالات کے مطابق حک و اضافہ اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ جو ہمیں کتب احادیث میں ایک ہی مسئلہ کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ درحقیقت مختلف اوقات میں طے کردہ مختلف فیصلے ہیں۔ ہماری کتب روایات میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ان میں فیصلے تو دیئے گئے ہیں لیکن ان احوال و ظروف کی تفصیل و تصریح نہیں دی گئی جن کی روشنی میں وہ فیصلے دیئے گئے تھے۔ قانون دان حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کسی فیصلے کے صحیح مفہوم و منطوق تک پہنچنے

کے لئے (CASE LAW) کا سامنے ہونا کتنا ضروری ہے۔ امت میں جو اس قدر فرقے پائے جاتے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ کے کسی ایک فیصلہ پر عمل شروع کر دیا اور دوسرے نے کسی دوسرے فیصلے پر۔ اور دونوں نے، اپنی اپنی جگہ سمجھ لیا کہ جس فیصلہ پر وہ عمل پیرا ہے، وہ ابدی قانونِ شریعت ہے، حالانکہ ان میں ابدی قانون کوئی بھی نہ تھا۔ یہ مختلف احوال و کوائف کے ماتحت صادر فرمودہ فیصلے تھے، جنہیں حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہنا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک عملی مثال پر غور فرمائیے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، زمین (یا وسائلِ پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ امت کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے اور مملکت اس کا انتظام کرتی ہے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں مختلف اوقات میں مختلف اراضیات مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ آپ نے مفادِ عامہ کے پیشِ نظر، حالات کے تقاضے کے مطابق، ان کے متعلق مختلف انتظامات فرمائے۔ مثلاً خیبر فتح ہونے پر، زمین کو مملکت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس میں سے کچھ حصہ فوجیوں کو دے دیا اور بقیہ حصہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا اور پیداوار میں حکومت اور اصل باشندوں، دونوں کو شریک کر لیا۔ وادی القریٰ کی کل زمین آپ نے اصل باشندوں کے پاس رہنے دی۔ اس کے برعکس، بنو نضیر جو جائیداد اور زمین چھوڑ گئے، آپ نے اُسے، مملکت کے زیرِ انتظام مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد تمام زمینیں خلافت کے زیرِ اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کا یہ اصول (کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی" وہ مملکت کی تحویل میں رہے گی) تو اپنی جگہ پر اٹل اور غیر متبدل رہا، لیکن زمین کا انتظام، موقعہ اور محل کے لحاظ سے بدلا جاتا رہا۔ (آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کا کیا انتظام کیا)۔

اسی طرح جرائم کی سزا کے سلسلہ میں بھی آپ نے مجرموں کے احوال و کوائف اور ان کی ذہنی سطح اور نفسیاتی کیفیت کے پیشِ نظر مختلف اوقات میں مختلف فیصلے صادر فرمائے۔ مثلاً ایک شخص نے شراب پی اور اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ آپ نے اس کی حالت کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تمہارا جرم معاف کر دیا ہے۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب الصلوٰۃ)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے ہمیشہ کے لئے شراب نوشی سے توبہ کر لی ـــــ یہ تھا اس میں اصلاح کا امکان جس کے پیشِ نظر حضورؐ نے اس پر تعزیر وارد نہیں کی۔ اسی طرح زنا کے واقعہ میں ایک شخص پکڑا گیا اور آپ نے اس کو سزا کا حکم بھی سنا دیا۔ لیکن بعد میں اصلی مجرم نے آکر کہا کہ مجرم وہ نہیں۔ میں ہوں۔ اس پر آپ نے دونوں کی سزا معاف

فرما دی ۔۔۔ پہلے کی اس لئے کہ وہ مجرم نہیں تھا، اور دوسرے کی یہ کہہ کر کہ اس نے ایک بے گناہ کو سزا سے بچانے کے لئے، اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ اس سے اس نے ایسی بلندی کردار کا ثبوت دیا ہے کہ وہ معافی کا مستحق ہو گیا ہے (نسائی)۔ اس قسم کی اکثر مثالیں حضورؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں میں ملتی ہیں۔ ایسے فیصلے کرتے وقت قوم کے عمومی جذبات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیر نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے اسے ابراہیمی خطوط کے مطابق تعمیر کر دیا جائے لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ

> اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اساس ابراہیمی پر اس کی تعمیر کرتا۔ اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر لیتا۔ (مسلم باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے تھے لیکن ان کی روشنی میں مختلف امور کے فیصلے کرتے وقت مصالح عمومی، افراد کے احوال و کوائف اور قوم کے امیال و عواطف کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح مختلف اوقات میں طریق کار کا بھی اختلاف ہوتا تھا۔ مثلاً عدل قرآن کا بنیادی اصول ہے جس میں کسی صورت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدل کو بروئے کار لانے کا طریقہ مختلف اوقات میں مختلف ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں،

> شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا، وہی دین ہو گا اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطرق الحکمیہ)

لہٰذا دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جائے، اس کے لئے قرآن کی سند یا رسول اللہ سے ثبوت ضروری نہیں۔ طریق کار حالات اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے بشرطیکہ یہ ہے کہ وہ طریق کار قرآنی اقدار سے نہ ٹکرائے۔ خود حضورؐ نے مختلف اوقات میں مختلف طریق کار اختیار فرمائے تھے۔

―――――― (۰) ――――――

خلافت راشدہ

حضورؐ نبی اکرم نے اس مملکت کو قائم فرمایا اور عملاً بتا دیا کہ اس میں ثبات و تغیر کا امتزاج کس طرح سے ہو گا۔ اس کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے

اور مملکت کا نظام خلافتِ راشدہ کی تحویل میں آگیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زمانۂ خلافت بہت مختصر تھا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مملکت کی حدود بہت پھیل گئیں۔ نئی نئی قومیں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں۔ مختلف تہذیبوں کے ساتھ واسطہ پڑا۔ متنوع انداز کے تمدن سامنے آئے۔ کاروبارِ مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس سے نئے مسائل ابھرے جن کا حل کرنا مملکت کا فریضہ تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

بیشک خدا نے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

ان نئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری تھا کہ نئے نئے فیصلے کئے جاتے۔ جو معاملات پہلی بار سامنے آتے تھے، ان کے لئے کسی قسم کے فیصلے کئے گئے، انہیں مؤرخین نے "اولیاتِ عمرؓ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور ان کی فہرست طویل ہے۔ جن امور کے فیصلے عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ کے زمانے میں ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں بھی تغیر و تبدل کیا۔ یہی وہ گوشہ ہے جو ہمارے موضوعِ پیشِ نظر کی رُو سے قابلِ غور ہے۔ ایسے فیصلوں کی تعداد بھی کثیر ہے لیکن قلتِ وقت کی بنا پر ان میں سے چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس وقت میرا مقصود تاریخی استقصار نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلامی نظام میں، ناقابلِ تغیر، قرآنِ کریم کے اصول و اقدار ہوتے ہیں، اور ان کی روشنی میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں، وہ حالات کے تغیر سے، بدلتے رہتے ہیں۔ نیز یہ کہ خود قرآنِ کریم کے احکام کا نفاذ بھی موقع اور محل کی رعایت سے، مناسب شرائط سے مشروط ہوتا ہے۔ وہ مثالیں جن کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت عمرؓ کے فیصلے

(۱) قرآنِ کریم میں مسلمان مردوں کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ میں اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اس سے روک دیا کہ مجھے خطرہ ہے کہ یہ عورتیں امت میں فتنہ برپا کرنے کا موجب بن جائیں گی

(احکام القرآن۔ ابوبکر جصاص۔ نیز کتاب الآثار امام محمدؒ)

(۲) اسی طرح، قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کے طعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کے شہروں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ذبیحہ خانے ہٹا دیئے جائیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہم اپنے انتظام کی بنا پر ان سے مستغنی ہو گئے ہیں۔ (المدونہ۔ کتاب الذبائح)

(۳) قرآنِ کریم میں صدقات کے مال میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا ہے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ اپنے سابقہ معاشرہ سے کٹ کر اسلامی معاشرہ میں داخل ہوں اور اس سے انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، تو اس مد سے ان کی امداد کی جائے۔ رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب ملک میں ایسی خوشحالی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب کے لئے الگ امداد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (احکام القرآن۔ جصاص)

(۴) رسول اللہ کے زمانے میں شرابی کو معمولی سی سزا دی جاتی تھی جس سے وہ اپنے کئے پر نادم ہو جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا۔ (سنن الکبریٰ)

(۵) قرآنِ کریم کی رُو سے، سرقہ (چوری) کی سزا قطع ید ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں اس سزا کو موقوف کر دیا۔ عام حالات میں بھی اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر، اضطراری حالت میں، چوری کر لیتا تو اسے سزا نہ دی جاتی۔ ایک شخص کے غلاموں نے کسی کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ان کا مالک انہیں بھوکا رکھتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مجبور ہو کر یہ اقدام کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چوروں کو تو معاف کر دیا اور اونٹ کے مالک کو ان غلاموں کے مالک سے یہ کہہ کر تاوان دلایا کہ اس جرم کے مرتکب درحقیقت تم ہو جس نے ان غلاموں کو بھوکے رکھ کر، انہیں چوری کرنے پر مجبور کر دیا۔ (آپ کا یہ فیصلہ، اسلامی نظامِ معیشت میں ایک بڑی اصولی اہمیت رکھتا ہے)۔

(۶) رسول اللہ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لیا نہیں جا سکتا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی فلاں شخص کی زمین میں سے گزرے۔ اور وہ اس کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستے میں بالکل مزاحم نہ ہو۔ (الخراج یحییٰ)

(۷) اس سلسلہ میں عہدِ فاروقی کا سب سے اہم فیصلہ عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں، اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ رسول اللہ کے زمانے میں اراضیات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، مسلمانوں کے قبضے میں آتے تھے جنہیں (مالِ غنیمت کے طور پر) بالعموم فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اگرچہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کے متعلق رسول اللہ نے بھی مختلف انتظامی طریق اختیار فرمائے تھے۔ جب عراق اور شام

کے علاقے فتح ہوئے۔ تو ایک تو وہ رقبے بڑے وسیع و عریض تھے، اور دوسرے وہاں کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں۔ صحابہؓ کی اکثریت کی رائے تھی کہ انہیں مالِ غنیمت کے طور پر فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ ان سے متفق نہیں تھے۔ یہ معاملہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اسے اعیانِ امت کی عام میٹنگ میں پیش کرنا پڑا۔ اس میں مختلف حضرات نے جو تقاریر کیں تاریخ کے اوراق نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے، اور وہ اس موضوع کے سمجھنے میں بڑی مفید ہیں

عراق کی زمینیں

ان کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا،

> یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور نسلاً بعد نسلٍ اسی میں منتقل ہوتی رہے؟ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہوگی۔ مجھے اس کا بھی خدشہ ہے کہ لوگ پانی کی باریوں پر بھی فساد کرنے لگ جائیں گے۔
>
> (لہذا میں ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھنا چاہتا ہوں۔ افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا)۔

پہلی میٹنگ میں فیصلہ نہ ہو سکا تو اسے دوسری میٹنگ میں زیر بحث لایا گیا۔ اس میں بھی بعض حضرات نے اپنے مؤقف کی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ رسول اللہؐ نے اراضیات کو فوجیوں میں تقسیم فرمایا تھا اس لئے ہمیں بھی ایسے ہی کرنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بڑی مبسوط اور مدلل تقریر فرمائی جس میں علاوہ دیگر دلائل و شواہد قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ مال فے میں مہاجرین اور انصار کا بھی حصہ ہے۔ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (۵۹/۱۰) اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا بھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس میں آنے والی نسلوں کا حصہ نہیں رہ سکتا اس لئے اسے مملکت کی تحویل ہی میں رہنا چاہیئے۔ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز درحقیقت کشا تھی کہ تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں۔

ان تاریخی شواہد کے پیش کرنے سے میرا مقصد اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ اگر حالات متقاضی

ہوں تو اسلامی نظام کی رُو سے، ایک اسلامی حکومت کے فیصلے، بعد میں آنے والی حکومت تبدیل بھی کر سکتی ہے اور ان میں حک و اضافہ بھی، بشرطیکہ یہ تبدیلیاں قرآن کے غیر متبدل اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔

(۰)

خلافتِ راشدہ کے بعد، اسلامی حکومت کا یہ نقشہ باقی نہ رہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کا وہ اصول جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے، اربابِ فکر و نظر کے سامنے نمایاں طور پر رہا۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے ملتِ اسلامیہ کے

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

مقننِ اعظم، امام ابوحنیفہؒ کی مثال متمیز طور پر آتی ہے۔ جہاں تک اسلامی قوانین و ضوابط پر تفقہ و تدبر کا تعلق ہے، امام صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر و تدبر کی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ دین کی اساس و بنیاد، قرآنِ کریم اور فکرِ انسانی پر ہے۔ جو کچھ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مسائل کا حل، غور و تدبر سے خود دریافت کرنا چاہیئے۔ اسے وہ اجتہاد یا تفقہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جو لوگ آپ سے متفق نہیں تھے، وہ آپ کے اس مسلک کو قیاس قرار دے کر اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس حد تک مذمت کہ وہ آپ سے کہتے تھے کہ اول من قاس ابلیس۔ فلا تقس۔ سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ لہٰذا تم ایسا نہ کرو۔ اسکے جواب میں امام صاحب فرماتے تھے کہ

> میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قیاس نہیں۔ وہ تو قرآن کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸)۔ ہم نے کتاب میں کسی بات کو بھی چھوڑا نہیں۔ لہٰذا جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ان لوگوں کے نزدیک قیاس ہے جنہیں خدا نے فہمِ قرآن کی نعمت سے نہیں نوازا۔ (کتاب المیزان)

امام صاحب اپنی عقل و فکر کی روشنی میں، قرآنِ کریم سے استنباطِ مسائل کرتے تھے، اور سابقہ ادوار کے فیصلوں کو، نظائر (PRECEDENTS) سے تعبیر کرتے تھے جن سے، معاملات کے فیصلے کرنے میں، استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انہیں ہر زمانے میں من و عن نافذ کیا جائے۔ ان کے نزدیک، عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کے فیصلوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، بہت سی مثالیں درج کی ہیں جن سے امام صاحبؒ کا مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً یوسف بن اسباط سے ابوصالح الفزاری یہ قول نقل کیا ہے کہ

> ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پائے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں

ہمعصر ہوتے) تو آپ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۳۶۹)

دوسرے مقام پر ہے۔

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسولؐ اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحاقؒ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔ (ایضاً صفحہ ۳۸۵)

آپکے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ

ابو عوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کیطرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اسکے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچئے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۶۹)

امام صاحبؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے شک ہے کہ رسولؐ اللہ نے ایسا فیصلہ دیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ رسولؐ اللہ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہوگا لیکن وہ فیصلہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

علامہ اقبالؒ کا تبصرہ

امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک تھا جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں،

> لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر مِن وعَن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔
>
> (خطبات۔ تشکیلِ جدید چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں۔

> غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ ابو حنیفہ نے، جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

> ان حالات کی روشنی میں میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے مِن وعَن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں، تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات صفحہ ۱۶۲-۱۶۳)

یہ تھا امام ابو حنیفہؒ کا مسلک جو عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں رائج مسلک کے عین مطابق تھا۔ لیکن

اس کے خلاف تحریک

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تحریک اُبھری جس کی رُو سے یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ جو کچھ پہلے زمانے میں ہو چکا ہے اس میں سرِمُو تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ وہ عین دین ہے اور اس میں تغیر و تبدل الحاد و بے دینی۔ جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا۔ جو کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اب غور و فکر (کہ جسے اجتہاد کہتے ہیں) کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شریعت کے جو احکام عہدِ رسالتمآبؐ میں نافذ ہو چکے تھے، وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ایک گروہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ان میں وہ احکام بھی شامل ہیں جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں نافذ العمل تھے۔ چنانچہ ان احکام کے مجموعے مرتب کئے گئے اور وہ امت کے لئے دائماً، ناقابلِ تغیر و تبدل ضابطۂ قوانین قرار پا گئے

اس تحریک کے پُرجوش محرک امام شافعیؒ نظر آتے ہیں۔ انہی نے یہ عقیدہ عام کیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وحی متلو اور دوسری وحی غیر متلو ۔ یہ دونوں خدا کی طرف سے بوساطتِ حضرت جبریلؑ نازل ہوتی تھیں۔ وحی متلو قرآن کے اندر درج کر دی گئی اور وحی غیر متلو احادیث کہلائی۔ لہٰذا رسول اللہ کو خدا کی طرف سے قرآن ہی نہیں دیا گیا۔ مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل دوسری وحی بھی دی گئی جو احادیث میں منضبط ہے۔ اس عقیدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے، حالانکہ نہ رسول اللہ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر امت کو دیا تھا اور نہ ہی خلافتِ راشدہ میں ایسا ہوا تھا۔ احادیث کا پہلا مبسوط مجموعہ جسے صحیح ترین مجموعہ کہا جاتا ہے امام بخاریؒ نے تیسری صدی ہجری میں مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ یعنی اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو فیصلہ حدیث کی رُو سے کیا جائے گا نہ کہ قرآن کی رُو سے ۔ اور پھر ایک قدم اور آگے بڑھے تو یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ حدیث قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

حدیث کی اس پوزیشن کی رُو سے جو کچھ احادیث کے مختلف مجموعوں میں آگیا (اور جسے صحیح قرار دے دیا گیا) وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پا گیا ۔ یہی عقیدہ آجتک چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا پہلا ہدف امام ابوحنیفہؒ کو قرار پانا تھا جنہوں نے یہ مسلک پیش کیا تھا کہ وہ فیصلے غیر متبدل احکام شریعت نہیں تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی طرف سے امام صاحبؒ کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جسے دہراتے ہوئے ہماری روح پر کپکپی چھا جاتی ہے۔ امام مالکؒ بن انس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتنہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ جب امام صاحبؒ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے اس قسم کے فتاویٰ کی وجہ سے امام صاحبؒ کے خلاف جذبۂ منافرت اس حد تک شدید ہو گیا کہ ابوعبید کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں، تو اسود نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لینے کے

جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ (یہ تمام تصریحات خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں موجود ہیں اور ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب 'مقامِ حدیث' میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے)۔

امامِ اعظمؒ کے مسلک کے متبعین نے کچھ وقت تک تو اس مخالفت کا مقابلہ کیا لیکن چونکہ مخالفین لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ لوگ منکرینِ حدیث ہیں اور منکرینِ شانِ رسالت ہیں' اس لئے انہیں اس سیلابِ بے پناہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لیا کہ جو احکام احادیث میں ہیں' وہ ناقابلِ تغیر ہیں' اور پھر اپنی فقہ کے فیصلوں کی تائید احادیث سے شروع کر دی۔ یوں خود فقہ حنفی کے فیصلے

اجتہاد کے دروازے بند

غیر متبدل قرار پا گئے اور ان پر اجتہاد کے راستے بند ہونے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ اس عقیدہ تک پہنچ گئے کہ (احادیث تو ایک طرف) جو کچھ ائمہ فقہ کہہ چکے ہیں وہ بھی قیامت تک ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے پیشوا اور مسلّم امام ابو الحسن عبید اللہ الکرخی کا قول ہے کہ "ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں' وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو' وہ ماوّل یا منسوخ ہے" (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری۔ صفحہ ۲۴۳)۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد تو ایک طرف' یہ حضرات اب کسی مزید تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ابھی دو سال ادھر کا ذکر ہے' جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ایک استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ

> یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی' دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔۔۔۔ لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں' تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔ (بحوالہ ایشیا - ۱۷ راگست ۱۹۶۸ء)

حالانکہ ان کے سامنے خود امام اعظمؒ کا یہ مسلک موجود ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں' یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو۔ اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش

نہ ہو۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہ رہ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحبؒ فیصلے فرماتے ہم انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحبؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہ رہ کو ابو یوسف سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔ (خطیب بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۳۵۲)۔ یہ تھا امام صاحبؒ کا مسلک خود اپنی فقہ کے متعلق۔ یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں' اس میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ جس فقہ کو خود اس فقہ کے بانی' امام ابو حنیفہ رہ ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیتے تھے' ان کے نام لیواؤں نے اسے قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے لیا۔ اور اس طرح امت پر اجتہاد کے تمام دروازے مستقلاً بند ہو گئے۔ یہ کیفیت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ عقل و فکر

عقل و فکر مفلوج ہو گئے

کی تمام صلاحیتیں' جنہیں قرآنِ کریم نے وجہ شرفِ انسانیت قرار دیا ہے' پہلے شل اور پھر رفتہ رفتہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔

مسلمان اصولی طور پر دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ ایک اہلحدیث اور دوسرے اہل فقہ۔ اہل حدیث کے نزدیک' علم دین سے مراد فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جو بات سامنے آئے' یہ بتا دیا جائے کہ اس کے بارے میں کتب روایات میں کیا آیا ہے۔ اور اہل فقہ کے نزدیک یہ کہ اس کے متعلق ائمہ فقہ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جو شخص جتنے زیادہ حوالے پیش کر سکے وہ اتنا ہی بڑا عالم تصور کیا جائے۔ اسلامی زندگی سے مقصود یہ قرار پایا کہ قدم بقدم اسلاف کے راستے پر چلا جائے۔ کسی نے اس سے سرِمُو انحراف یا تجاوز کیا اور اربابِ شریعت کی بارگاہوں سے کفر و الحاد کے فتووں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اسلاف کی تقلید میں کس درجہ شدت اختیار کی گئی' اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ اموی دورِ حکومت میں' دمشق میں سب سے بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی اور اس کے بعد دیگر مساجد اس کے رُخ پر بنائی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد مسلمان انجنیروں

تقلید کی شدت

نے حسابی قاعدہ کی رُو سے دیکھا کہ جامع دمشق کا رُخ صحیح کعبہ کی سمت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد میں صفوں کا رُخ بدل دیا جائے اور آئندہ مساجد صحیح سمت کے مطابق تعمیر کی جائیں۔ مسئلہ اربابِ شریعت کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جامع دمشق کا رُخ جانب قبلہ نہیں تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے اسلاف نے جس قدر نمازیں پڑھیں وہ درست نہیں تھیں۔ ہم چند انجنیروں

کی بات پر اپنے اسلاف کی شان میں اس قدر سوء ادبی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان مساجد کا رُخ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح وہی ہے جو اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ کل خیر فی اتباع السلف۔ نیکی اور بھلائی بہ تمام و کمال اسلاف کے اتباع میں ہے۔ (بحوالہ شامی)

چنانچہ مساجد کا رُخ نہیں بدلا گیا۔ اور یہ مسلک اور عقیدہ اس قوم کا ہے جس کا خدا کفار کے متعلق کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان پر عقل و فکر کی روشنی میں غور کریں، اور دلائل و براہین کی رُو سے ان کے متعلق بحث و تمحیص کریں، یہ اتنا کہہ کر ان حقائق سے انکار کر دیتے ہیں کہ

تقلید اور قرآن

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۲)۔ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک راستے پر چلتے پایا اور ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائینگے۔ اس لئے ہم کوئی ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے جو ہمیں اسلاف کے راستے سے دوسری طرف لے جانے کا موجب بنے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم قرآن کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے پایا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱/۲۱) خواہ شیطان انہیں جہنم کی دعوت ہی کیوں نہ دے، یہ اُسی راستے پر چلتے جائینگے۔

اس کے جواب میں ہمارے اربابِ شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز نہیں قرار پا سکتی۔ ایسا کہتے وقت وہ اس علت پر غور نہیں کرتے جس کی بنا پر تقلیدِ اسلاف سے روکا گیا ہے، وہ علت یہ ہے کہ خدا جب مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس لئے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی راہنمائی غیر متبدل ہونے کی وجہ سے ہر زمانے میں واجب الاتباع ہوتی ہے، اور اسلاف کا مسلک خواہ ان کے زمانے میں صحیح بھی کیوں نہ ہو، ہر زمانے میں اتباع کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے ابدی پیروی کتاب اللہ کی ہوگی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کی روش کی۔ حضورؐ نبی اکرم کا یہ ارشادِ گرامی اس باب میں قندیلِ ہدایت ہے آپ نے فرمایا۔

الناس اشبه بزمانهم من اسلافهم۔ (جاحظ۔ البیان والتبیین)
لوگ، اپنے اسلاف کے مقابلہ میں، اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

دین میں اس قدر جمود و تقلید کی بنیادی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ہماری حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ اس سے

جمود کی دوسری وجہ

زندگی میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہو گئی۔ دنیاوی امور حکومت نے اپنے ذمے لے لئے اور شرعی امور (جن سے مراد شخصی قوانین تھے) اربابِ شریعت کے حیطۂ اقتدار میں چلے گئے۔ سلطنتیں 'اپنے دائرہ اختیار میں' قوانین میں ردّ و بدل کرتی رہیں لیکن اربابِ شریعت نے اسی میں عافیت دیکھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ اسی کی پابندی کرتے رہیں۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کر لیا گیا کہ ہر آنے والا زمانہ' سابقہ زمانے کے مقابلہ میں' برّ و تقویٰ ہی میں نہیں'

ماضی درخشندہ حال تاریک

علم و بصیرت میں بھی پست تر اور خراب تر ہوتا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری سنایا کرتے تھے کہ اثنائے حج میں انہوں نے دیکھا کہ مکہ کا ایک نجدی نانبائی' پکار پکار کر کہا کرتا کہ آج کی روٹی دو پیسے میں۔ کل کی (باسی) روٹی ایک آنہ میں۔ انہوں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں بیچتے ہو اور کل کی باسی ایک آنہ میں۔ کہنے لگا کہ کل کی روٹی رسول اللہؐ کے زمانہ سے ایک دن قریب تر ہے اس لئے قیمت میں گراں تر۔ یہ ذہنیت اگر انفرادی جذبات کی حد تک رہتی تو پھر اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے اصولِ دین کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کو اپنا ماضی روشن دکھائی دیا' حال تاریک' اور مستقبل تاریک تر۔

علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی اس صورتِ حال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بنیادی

علامہ اقبالؒ کا تصورِ اسلام

وجہ' مسلمانوں کی کسی مملکت کا بھی اسلامی نہ ہونا ہے۔ اگر کسی ایسی مملکت کا قیام عمل میں آجائے جس میں صحیح قرآنی نظام نافذ ہو' تو اسلام از سرِ نو زندہ ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اُس اسلام کا تصور کیا تھا جسے وہ اس طرح زندہ کرنا چاہتے تھے' اس کے متعلق انہوں نے اپنے خطبات' تشکیلِ جدید' کے چھٹے خطبہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کا عنوان ہے ــــ اسلامی قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء ــــ اس میں انہوں نے کہا ہے۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے

پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تصور انہوں نے ۱۹۲۸-۲۹ء میں پیش کیا اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے خطبہ میں، انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد رکھ دی ـــ قائداعظمؒ نے جب اس مطالبہ کو اپنایا تو ان کے پیشِ نظر بھی اسلامی نظام کا یہی تصور تھا۔ میں نے قائداعظمؒ کے ساتھ اپنے تعلقات کا کبھی چرچا نہیں کیا اس لئے کہ اس سے (بالخصوص ان کی وفات کے بعد) خودستائی اور نمودِ خویش کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن

قائداعظمؒ

میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس موضوع پر ان سے میری اکثر گفتگو رہتی تھی (بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان سے میرے تعلقات کی بنیاد ہی یہ تھی)۔ اسلامی نظام کا یہ تصور ان کے ذہن میں بھی بالکل صاف تھا اور اس کی طرف انہوں نے کئی بار اپنی تقاریر اور بیانات میں اشارہ بھی کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کا وہ بیان جو انہوں نے حیدرآباد (دکن) کے طلبا کے سوال کے جواب میں دیا تھا، ایسا واضح ہے کہ اس کی روشنی میں اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی مملکت، جس کے لئے مطالبۂ پاکستان پیش کیا جا رہا ہے، کی امتیازی خصوصیت کیا ہے، فرمایا تھا۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے

حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

علامہ اقبالؒ تو حصولِ پاکستان سے پہلے ہی عالمِ بالا کو تشریف لے گئے اور قائداعظمؒ یوں کہیئے کہ ہنوز آئینِ پاکستان کی پہلی اینٹ بھی رکھنے نہ پائے تھے کہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی اجارہ داری ان حضرات نے اپنے ہاتھ میں لے لی جن کے سامنے اسلام کا وہی جامد تصور تھا جس کی جگہ حقیقی اسلام کے احیاء کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ یہ اس قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے، جب منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے حضرات علماء کرام پیش ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں نہ تو قانون سازی کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجلسِ قانون ساز کی حاجت۔ ہمارے پاس مکمل ضابطۂ قوانین بنا بنایا موجود ہے۔ حکومت کا کام فقط اتنا ہے کہ اس ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ اور اگر کسی باب میں انہیں کوئی دشواری پیش آئے تو اس کی بابت ہم سے پوچھ لے۔ دوسری طرف ارباب نظم و نسق کو اس کا احساس تھا کہ جس فقہی ضابطہ کو یہ حضرات یہاں نافذ کرانا چاہتے ہیں، وہ آج سے صدیوں پہلے کے حالات کے مطابق مرتب ہوا تھا۔

پاکستان میں کشمکش

اور موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر وہ ممکن العمل ہی نہیں رہا۔ یہ حضرات ان دشواریوں کو جانتے تھے لیکن ان میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کھل کر کہے کہ یہ ضابطہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا اس لئے ہم اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود قوانین وضع کریں گے۔ چنانچہ وہ بھی اس مبہم اصطلاح کی آڑ میں اس سوال کو ٹالتے رہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گرداب جس میں مملکت کی کشتی تئیس سال سے پھنسی ہوئی ہے اور حساس قلوب کی ہزار تپش و خلش کے باوجود ایک انچ بھی ساحلِ مراد کی طرف نہیں بڑھی۔ پھر مشکل یہ ہے کہ یہ سوال قانون سازی تک ہی محدود نہیں، قدامت پرست طبقہ کا تقاضا ہے کہ اسلاف کا اتباع، زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے۔ وضع قطع تراش خراش، رہن سہن، نشست و برخاست، خورد و نوش، حتیٰ کہ فکر و خیال تک میں ان کی عائد کردہ حدود و قیود کی پابندی لازمی ہے۔ زمانے کا سورج ہر نئی صبح نئی دنیائیں اپنے جلو میں لاتا ہے، لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ کسی نئی بات کے متعلق ذہن میں خیال تک لانا بھی حرام ہے۔ ان کا یہ اعلان ہر خطبہ میں، ہر محراب و منبر سے، ہر مکان میں مسلسل ڈالا جاتا ہے کہ

کل بدعۃ ضلالۃ۔ و کل ضلالۃ فی النار۔ ہر نئی بات گمراہی ہے اور

ہرگز راہی جہنم میں لے جانے کا موجب۔

اور یہ ہے جدید و قدیم کی وہ کشمکش جس میں ہماری نئی نسل اس بُری طرح سے گرفتار ہے۔ اس صورتِ حالات کچھ ہم ہی دوچار نہیں ہوئے، دنیا کی ہر "مذہب پرست" قوم کو اس سے واسطہ پڑا ہے۔ لیکن ان کے ہاں اس کا علاج آسان تھا۔ انہوں نے مذہب کو گرجوں اور مندروں میں بند کیا اور زندگی کے معاملات میں پوری پوری آزادی حاصل کر لی۔ ہمارے ہاں کا مذہب پرست طبقہ، اس دلیل کی آڑ میں کہ پاکستان 'اسلامی نظام' کے قیام کے لئے حاصل کیا گیا تھا' اور اسے صرف علماء حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہے' مملکت کا پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے مصروفِ جد و جہد ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے (یا نہیں سمجھنا چاہتے) کہ اب تھیاکریسی کا زمانہ لد گیا۔ اس لئے ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے اپنی ضد کو نہ چھوڑا، تو یہاں بھی وہی حالت ہو جائیگی جو یورپ (یا دیگر مذہب پرست ممالک) میں ہوئی ہے۔ مذہب کو مساجد کے حجروں میں محبوس کر دیا جائے گا اور مملکت لادین ہو جائے گی — یعنی وہ دین کے ابدی اصول اقدار کو بھی چھوڑ دیگی — اور یہ ہماری ہی نہیں' نوعِ انسانی کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔

اس کشمکش کو آپ قدیم و جدید کی آویزش یا دین اور مذہب کی کشاکش کہہ لیجئے، لیکن اس باب میں خود مذہب پرست طبقہ (قدیم) کے اندر جو باہمی کشمکش ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہاں اسلام کا اس قسم کا نقشہ قائم کرنے کی تجویز یا کوشش کی جا رہی ہے کہ پرسنل لاز کی حد تک ہر فرقہ کو اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہو لیکن پبلک لاز فقہ حنفی کے نافذ کئے جائیں کیونکہ اس فقہ کے پیرؤں کی یہاں اکثریت ہے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقے (سنی اور شیعہ دونوں) احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ وہ فقہ حنفی کو کتاب و سنت کی صحیح تعبیر تسلیم ہی نہیں کرتے (اس کی مزید تشریح میں ذرا آگے چل کر پیش خدمت کروں گا)۔

یہ ہے وہ کشمکش جس میں یہ بدقسمت ملک اس وقت بُری طرح الجھا ہوا ہے اور جس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جو اس ملک کو اس تباہی سے بچانے کا احساس اور درد اپنے سینے میں رکھتا ہے تو اس کے لئے فی الواقعہ — یہ گھڑی محشر کی ہے — اس طبقہ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے وہ کچھ سننا پڑے گا جو امام ابو حنیفہؒ نے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے سنا تھا اور جو خود مجھے تیئس سال سے سننا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس طبقہ کے لئے یہ بشارت بھی ہے کہ اگر وہ اس خطۂ پاک میں حقیقی اسلام کے احیاء میں کامیاب ہو گئے تو پھر وہ دینی مملکت پاکستان میں ہی قائم نہیں ہوگا، اس کے عالمگیر ہو جانے کے راستے بھی ہموار ہو جائینگے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے

دین الحق کے معنی کہ دین الحق' تمام ادیانِ عالم پر غالب آسکتا ہے تو اس میں الحق کی خصوصیت

کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ عربی زبان میں حق اسے کہتے ہیں جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل بھی ہو، اور اس کے ساتھ ہی، عند الضرورت متحرک بھی۔ عرب کسی مقام پر حق کا لفظ بولتے تھے، اسے سمجھ لیا جائے تو دینِ الحق کی بنیادی خصوصیت سامنے آجاتی ہے۔ آجکل ہمارے دروازوں میں قبضے (HINGES) لگے ہوتے ہیں لیکن پہلے زمانے میں دروازے کی چول، ساکٹ (SOCKET) میں فٹ کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دروازہ اپنے مقام پر محکم بھی رہتا تھا اور ضرورت کے مطابق کھلتا اور بند بھی ہوتا تھا۔ اس طریقِ عمل کو وہ لوگ حق سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ امام راغبؒ حق کے معنی مطابقت اور موافقت کرتے ہیں۔ دینِ وہی الحق ہو سکتا ہے جس کی کیفیت دروازے کی طرح ہو کہ حفاظت کے لئے وہ محکم طور پر بند بھی ہو سکے اور آنے جانے کے لئے کھل بھی سکے۔ اگر دروازہ مستقل طور پر بند ہے تو اسے دروازہ نہیں کہا جائے گا۔ اس کی حیثیت جامد دیوار کی سی ہو جائے گی۔ اور اگر وہ ہمیشہ کھلا ہی رہے، بند نہ ہو سکے تو اس میں اور کھلے میدان میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ دروازہ جب تک حالات کے مطابق، کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے، دین کہلاتا ہے۔ جب وہ ایک جگہ جامد ہو جاتا ہے، مذہب بن جاتا ہے۔ لہٰذا، جو اسلام کو بہ حیثیت دینِ الحق زندہ کرنے کے متمنی ہیں، ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اسے دروازے کی حیثیت سے از سرِ نو قائم کریں۔ یعنی ایسا نظام قائم کریں جس میں:۔

(۱) قرآنِ کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصولی و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں۔ قرآنی اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام میں عند الضرورت تغیر و تبدل اور حک و اضافہ ہوتا رہے۔ ان قوانین کی تدوین کی سلسلہ میں ان احکام و ضوابط سے استفادہ کیا جائے جو اس سے پہلے مختلف زمانوں میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔

(۲) قرآنی احکام کو نافذ کرتے ہوئے، موقع و محل، احوال و کوائف، قوم اور افراد کی ذہنی اور نفسیاتی سطح اور اپنے زمانے کے عام تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات کو سامنے رکھا جائے۔

(۳) قرآنِ کریم نے جس قرآنی معاشرہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دیا ہے، اسے بطور نصب العین سامنے رکھا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ وہاں سے بتدریج اُس نصب العین کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا جائے۔

(۴) نبی اکرمؐ کی جس سیرت طیبہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے اس کے نمایاں خط و خال قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسے سیرت و کردار کا معیار قرار دیا جائے اور دیکھا جائے کہ قوم انفرادی اور اجتماعی

حیثیت سے کس حد تک اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

(۵) نظامِ تعلیم ایسا مرتب کیا جائے جس سے ایک طرف طلباء میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، انہیں معلوم ہو کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے، اور دوسری طرف ان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو کہ قرآنی اصول و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اور

(۶) مملکت میں ایک ادارہ ایسا ہو (مثلاً سپریم کورٹ) جو اس بات پر نگاہ رکھے کہ مملکت کا کوئی قدم قرآنی اصول و اقدار کے خلاف نہ اُٹھے۔

ایسے نظام کے قیام کی مخالفت، دنیا کے ہر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف سے ہوگی۔ یعنی ان ارباب سیاست کی طرف سے جو سیکولر حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اور نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے۔ اس مخالفت میں "خدا اور رسول" کے نام کو سب سے پہلے بطورِ حربہ استعمال کیا جائے گا تاکہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے میں آسانی ہو۔ لہٰذا اس نظام کے قیام کے لئے، مومنانہ فراست کے ساتھ، قلندرانہ عزم اور بے باکانہ جرأت کی ضرورت ہوگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

> یہ سوال کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی رُوح کو لے کر آگے بڑھے — وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ
>
> حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ۔
>
> ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

جس قوم اور جس ملک میں یہ روحِ عمرؓی ابھری، اسلامی نظام اسی میں قائم ہو سکے گا — باقی رہا مذہب، وہ خواہ عیسائیوں کا ہو یا یہودیوں کا، ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا — اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تدبّر کی فسوں سازیاں یا تقدس کی سحر کاریاں اسے زمانے کے تھپیڑوں سے بچا نہیں سکیں۔ دین، حق ہوتا ہے اور مذہب باطل — وَ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا — باطل کو بہر حال میدان چھوڑنا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ اور اسکے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، سُنَّۃَ اللّٰہِ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا — لیکن مذہب جاتے جاتے بھی،

اپنی حرکتِ مذبوحی یا رقصِ بسمل سے جو ننگا یہاں مچا ہے اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ذرا پہلے مجملاً بتایا ہے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد یہاں مطالبہ شروع کر دیا گیا کہ چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اس لئے یہاں اسلامی نظام نافذ اور اسلامی قوانین رائج ہونگے۔ میں نے کہا کہ اس مطالبہ کو مجمل نہ رکھیے۔ اس کی ذرا تشریح کیجئے۔ تو اس تشریح کی رو سے کہا گیا کہ یہاں "کتاب و سنت" کے مطابق قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ "کتاب و سنت" کی رو سے کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اس لئے اس اصول کے مطابق یہاں اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکیگا۔ مذہب پرست طبقہ کے پاس اس اعتراض کا جواب گالیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے، ملحد ہے، بے دین ہے، حتیٰ کہ کافر ہے — تئیس برس کی مسلسل گالیوں کے بعد جماعتِ اسلامی (جو اس مخالفت میں سب سے آگے تھی) کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

لہٰذا پرسنل لاز کی حد تک تو مختلف فرقوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں لیکن پبلک لاز کے لئے فقہ حنفی کو رائج کیا جائے گا جو یہاں کی اکثریت کی فقہ ہے۔ اہلِ حدیث فرقہ کی طرف سے اس تجویز کی پہلے ہی سخت مخالفت ہو چکی ہے، اب شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی فرقے کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے اسے ہم سے بطور قوانینِ شریعت زبردستی منوایا جائے[1]۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

> اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائینگے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے ہی سہی۔ (پمفلٹ — آئینِ پاکستان اور مسلمہ اسلامی فرقے —
>
> شائع کردہ۔ سید محمد رضا رضوی، کنوینر، ادارۂ فلاحِ ملت پاکستان۔ حیدرآباد)

جب یہاں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور ملک خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا تو اس سے بچنے کی اس کے سوا کوئی شکل نظر نہیں آتی تھی کہ یہاں سیکولر نظامِ حکومت رائج کیا جائے۔ اور اگر یہاں سیکولر نظام رائج کر دیا گیا تو

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے وہ مقالہ دیکھئے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع کیا گیا ہے۔ اور اب اس کا پمفلٹ بھی چھپ چکا ہے۔

اس کا منطقی نتیجہ یہ مطالبہ ہوگا کہ اب پاکستان کو ہندوستان سے الگ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ دو قومی نظریہ یہاں پہلے سے ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہاں غیر مسلموں کو ایک الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ اور نظام حکومت یہاں سیکولر ہے۔ اس سے وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور جب وہ بنیاد ہی ختم ہو چکی ہے تو اسے الگ مملکت رکھ کر ہندوستان کے ساتھ جنگ کا مسلسل خطرہ برقرار رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ہماری نئی نسل کے دل میں ـــ جسے اسلام کی حقیقی تعلیم سے یکسر بیگانہ رکھا گیا ہے ـــ یہ خیالات ابھریں گے اور اس کا جو نتیجہ ہوگا اُسے زبان تک لانے کی میں اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ اس سے ان لوگوں کا مقصد حاصل ہو جائیگا جنہوں نے شروع ہی سے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، اور جو مذہب کے نام پر یہاں مسلسل خلفشار پیدا کرتے رہے۔ قرائن سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسے ہی ارادے لیکر پاکستان آئے تھے۔

لہٰذا مملکتِ پاکستان کو ان خانہ جنگیوں اور اس کے بعد ابدی موت سے بچانے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ قرآن مجید کو اساس تسلیم کرکے ایک جدید فقہ (ضابطہ قوانین) مرتب کیا جائے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پائے۔ اور اگر یہ فرقے اس پر بھی رضامند نہ ہوں تو پھر اپنے آپ کو فریب میں رکھنے کے بجائے اسے کھلے بندوں تسلیم کر لیا جائے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

یاد رکھیئے۔ مذہب اور دین دو متضاد عناصر ہیں جو ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے جو قوم مذہب چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی دین اختیار نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ خود حضورؐ نبی اکرمؐ کی دعوت کو اہلِ کتاب نے قبول نہیں کیا تھا۔ ان کے راستے میں مذہب حائل ہو رہا تھا۔ قرآن کریم نے ایمان باللہ کے لئے کفر بالطاغوت کو لازمی شرط قرار دیا ہے اور دین کے مقابلہ میں سب سے بڑا طاغوت مذہب ہوتا ہے۔ بنابریں، اگر موجودہ مسلمان مذہب چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کے ہاں دین کا نظام قائم نہیں ہو سکیگا۔ یہ نظام اس قوم کے ہاں قائم ہو سکے گا جو مذہب کو تیاگ چکی ہو اور اس کے بعد وہ مذہب پرست مسلمانوں کی تبلیغ سے نہیں بلکہ از خود قرآن مجید پر غور و تدبر کے بعد اسلام کی طرف آئے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی تبلیغ سے تو وہ کسی نہ کسی فرقہ میں داخل ہوگی دین اختیار نہیں کرے گی۔

قدیم اور جدید کی کشمکش درحقیقت مذہب اور دین کی کشمکش کی ابتدا ہوتی ہے اور انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے یہ علامت بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ اس سے جمود کی سلیں ٹوٹتی اور فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت میں اپنے اس خطاب میں کر رہا ہوں جسے اتوار کی صبح آپ احباب کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس لئے اب میں بصد شکریہ آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

والسلام

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۰ء

مجلسِ مذاکرہ

منعقدہ - ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء بروز ہفتہ

عنوان :- اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

زیرِ صدارت :- محترم حسن عباس رضوی صاحب (کوئٹہ)

شرکائے مذاکرہ

۱۔ سلمیٰ لطیف (جماعت پنجم)
۲۔ سلیم عبدالقیوم (الف۔ایس سی)
۳۔ ثریا عندلیب (نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام خواتین)
۴۔ خالد محمود سید (بی۔ایس سی۔بی۔ایڈ)
۵۔ غلام صابر (ایم۔اے اردو، ایم اے فارسی)
۶۔ خالدہ عندلیب (الف۔ایس سی)
۷۔ افتخار حفیظ (الف۔ایس سی)
۸۔ محمد احمد (ایم اے۔ایل۔ایل بی)
۹۔ نوشابہ (طالبہ ایم۔اے)
۱۰۔ شاہد امین حیدر (الف۔ایس سی)
۱۱۔ شوکت پرویز (الف ایس سی)
۱۲۔ مسرت چغتائی (ایم۔اے فلاسفی)
۱۳۔ خاور خورشید بٹ (بی اے)
۱۴۔ عارفی سلطانہ (ایم۔اے اردو، ایم اے فلسفہ)
(۱۵)۔ نجمہ پرویز (بی۔اے)
(۱۶) سلمیٰ پرویز (ایم۔اے طالبہ)

سلمیٰ لطیف
(پانچویں جماعت کی طالبہ)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

مذاکرے کے لئے یہ آدھا شعر میرے بھائی جان نے سنایا اور کہا کہ وہ اس مذاکرے میں حصہ لیں گے۔ بھائی جان اکثر تقریریں کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی گھر میں بھی عزت ہوتی ہے اور کالج میں بھی۔ میرے دل میں یہ بات بار بار پیدا ہوتی تھی کہ یا اللہ مجھے بھی تھوڑا سا بڑا کر دے تاکہ میں بھی تقریر کر سکوں۔ میں اب بڑی ہو گئی ہوں، لیکن مجھے سب لوگ ابھی چھوٹی بچی ہی سمجھتے ہیں حالانکہ میں پانچویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔ دینیات، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور انگریزی میرے مضامین ہیں۔ چاول پکا سکتی ہوں۔ چائے بنا سکتی ہوں۔ لیکن کوئی میری بات ہی نہیں سنتا۔ مجھے کہنا یہ ہے صاحبِ صدر! کہ میری ایک سہیلی ہے فرزانہ۔ ہم اکثر اکٹھی کھیلتی ہیں۔ ایک دن اس نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا تو کہنے لگی۔ ہائے اللہ! تم نماز کیسے پڑھتی ہو۔ ہمارے گھر میں تو اس طرح کوئی نماز نہیں پڑھتا۔ میں نے کہا۔ میرے ابو اسی طرح پڑھتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔ وہ کہنے لگی، میرے ابو بھی تو غلط نہیں پڑھتے۔ اس بات پر ہماری اچھی خاصی تو تو میں میں ہوئی اور آخر طے یہ پایا کہ محلے کے مولوی صاحب سے پوچھا جائے کہ نماز ہاتھ باندھ کر پڑھنی چاہیے یا چھوڑ کر۔ چنانچہ یہ جھگڑا ہم نے مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ مولوی صاحب بڑے نیک آدمی ہیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو پیار کیا اور بتایا کہ نماز ہم دونوں کی غلط ہے۔ کیونکہ رفع یدین کے بغیر تو نماز ہوتی ہی نہیں اور پھر انہوں نے ہمیں رفع یدین کا طریقہ بھی سکھایا۔ گھر آکر میں نے ابو کو یہ طریقہ بتایا تو انہوں نے کہا مولوی صاحب غلط کہتے ہیں۔ ادھر فرزانہ کے ابو نے کہا کہ مولوی صاحب اصلی مسلمان نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ میرے ابو۔ مولوی صاحب اور فرزانہ کے ابو میں سے اصلی مسلمان کون ہے۔

اسی طرح پچھلے دنوں مجھے اپنے ابو کے ہمراہ ایک میلہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ میلہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک مزار پر لگتا ہے۔ میلے میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں اور ابو مشکل سے مزار تک پہنچ پائے۔ مزار کے احاطے میں رنگ برنگ قسم کے لوگ عجیب سا ناچ ناچ رہے تھے۔ دیوار سے لگی بیٹھی کچھ عورتیں جھولیاں پھیلائے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ مزار کے اندر سے حق ہو دم مست قلندر قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ اتنے میں کچھ لوگ ڈھول کی آواز پر ناچتے ہوئے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا بکرا تھا۔ عجیب بات یہ کہ بکرے کے

سر پر سہرا بندھا ہوا تھا۔ میں سمجھی بچے کی شادی ہو رہی ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ بکرا مزار پر بطور چڑھاوا لایا گیا ہے۔ مزار کے اندر پہنچ کر بکرا تو تن کر کھڑا ہو گیا لیکن وہ سبھی لوگ سجدے میں گر گئے۔ میں نے ابو سے پوچھا کہ آپ تو کہتے تھے مسلمان اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا یہ درست ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے۔ میں نے پوچھا کیا یہ ملنگ قسم کے لوگ بھی مسلمان ہیں۔ ابو سر جھکا کر کہنے لگے۔ ہاں بیٹی یہ بھی مسلمان ہیں۔

جنابِ صدر! میں لاکھ چھوٹی سہی لیکن میں پوچھتی ہوں آپ بڑوں سے کہ کیا ہم سب کا خدا ایک نہیں؟ ہمارا رسول اور قرآن ایک نہیں؟ اور اگر ہے تو پھر مسلمانوں کی اتنی قسمیں کیوں ہیں؟

جنابِ صدر! یہ تو مجھے اب پتہ چلا ہے کہ ہمارا صرف نماز پر ہی جھگڑا نہیں بلکہ قرآن اور حدیث پر بھی ہے ہمارا جھگڑا حج اور زکوٰۃ پر بھی ہے، روزے اور عید پر بھی ہے اور پھر کمال یہ کہ ان تمام جھگڑوں کے باوجود ہم سبھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو، مجھے تو آپ صرف اتنا بتا دیجئے کہ وہ کون سا اسلام ہے جسے اپنا کر مسلمان اور غیر زندہ کی دوستی قائم رہ سکتی ہے۔ اور اگر آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے تو میں اپنے خدا سے اس کے سوا کیا کہہ سکتی ہوں کہ

"اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

میں مشکور ہوں کہ آپ نے میری بات تو سن لی۔ ورنہ ہم بچوں کو تو لوگ مسجد سے بھی اٹھا دیتے ہیں۔ شکریہ!

سلیم عبد القیوم
سال دوم کا طالب علم

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

صدرِ محترم! زندگی مسلسل سعی و کاوش اور ہر آن جد و جہد کا نام ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں سے جہاد کرنے کا نام ہے۔ لیکن جب انسانی زندگی میں اس قدر خوفناک چٹانیں کھڑی کر دی جائیں اور زندگی ٹھہراؤ اور جامد پن کا شکار ہو کر رہ جائے تو مایوسی کا پیدا ہو جانا کوئی عجوبے کی بات نہیں ـــــ جس دور میں ہم زندہ ہیں اس میں زندگی جامد ہو چکی ہے۔ متوکلانہ قناعت کا اجتماعی رویہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل رہا ہے اور وہ مردِ مولا صفت جو مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کے ساتھ اس دنیا کو جنت بنانے کے لئے اٹھتا ہے وہ موجودہ دور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ـــــ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے ـــــ اس لئے کہ مسلمان کی بنیادی پہچان ہی یہ ہے کہ

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ہمارے معاشرے کا اجتماعی منصوفانہ قناعت کا رویّہ، نئی نسل کے لئے سدِّ راہ بنا ہوا ہے ۔۔۔ نئی نسل موجودہ دور کی خوفناک تاریکیوں کو فضا سے نور میں تبدیل کرنے کی آرزومند ہے۔ لیکن مذہب کے تصوّرات جوان کے تخیلات پر پتھروں کی بارش برساتے ہیں، وہ انہیں قناعت پسند طبیعت کا خوگر بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ نئی نسل کا ایک حصّہ قناعت پسند ہو گیا ہے۔ وہ اندھیروں میں ہی زندہ رہنے کا خوگر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑا حصّہ اس صورتِ حال سے مطمئن نہیں۔ وہ موجودہ ماحول کو بدلنا چاہتا ہے۔ موجودہ غلط تصورات کو ختم کر کے، نورِ بصیرت کو عام کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسانیت کو اس کے مقامِ شرف و مجد سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے اور وہ اس کا سراغ لگانا چاہتا ہے کہ

ہے آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

صاحبِ صدر! نئی پود کا یہی حساس اور ذہین طبقہ ہمارا موضوعِ بحث ہے۔ اس طبقہ کی پُر درد داستانیں ہمارے معاشرے ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لئے دردِ سر بنی ہوئی ہیں۔ ہم آج انہی فرزندانِ توحید کی آہوں کو تلاش کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں جن کے نقوشِ عمل، تہذیب کی بلند ترین منزلیں بن گئے ہیں۔ جنابِ والا! سب سے پہلا سبب جو ہمارے معاشرے کو گمراہی کے غار میں دھکیل رہا ہے، وہ معاشی تفاوت ہے۔ اور اس کو تقویت دینے یا برقرار رکھنے والا طبقہ ملاؤں کا ہے۔ معاشی تفاوت اس لئے ہے کہ ہمارا معاشی نظام قرآنی اصولوں پر نہیں بلکہ ملوکیت کی پیدا کردہ مذہبی پیشوائیت کی ابلہ فریبیوں پر استوار ہے۔

صاحبِ صدر! ضرورت تو ایسے معاشرہ کی ہے جہاں ہر فرد کی صلاحیتوں کی نشو و نما بطریقِ احسن ہو سکے۔ لیکن یہ مذہبی پیشوائیت کے علمبردار یہ عقیدہ پھیلاتے ہیں کہ جب کوئی متنفس اس جہان میں آتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کا رزق اور اس کی تقدیر اس کے پلّے باندھ دیتا ہے۔ یعنی اگر وہ غریب کے ہاں پیدا ہوا ہے تو یہ اس کا مقدر ہے کہ غربت کی صعوبتیں برداشت کرے۔ اور اگر امیر کے ہاں پیدا ہوا ہے تو اپنی زندگی کی ابتدا موٹر کار سے کرتا ہے۔ یہ الفاظ کسی ایک کے نہیں بلکہ مذہبی پیشوائیت کے جتنے بھی علمبردار ہیں وہ اسی انداز سے سوچتے ہیں ۔۔۔ صاحبِ صدر! ایسی صورتِ حال سے بیزار ہو کر نئی نسل بغاوت کر رہی ہے۔ نئی نسل مسلمان ہے اور مسلمان رہنا چاہتی ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کے اس اسلام سے آزاد رہنا چاہتی ہے جس کی بنیادیں ظلم اور بربریت پر استوار ہیں۔

صدرِ محترم! میں اپنی اس بات کو چند معاشرتی مشاہدوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں

آپ ہمارے معاشرے کے ان غریب گھرانوں کے لوگوں کی زندگی میں جھانک کر دیکھیں جن کو پیٹ بھر کر ایک وقت کی روٹی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ سارا دن نوکری کی تلاش میں ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں اور آخر رات کو سرد آہ بھر کر سو رہتے ہیں۔ ان کے بچے سارا دن گندی مٹی میں کھیلتے رہتے ہیں۔ گندی نالیوں اور بدبودار ماحول میں پل کر جوان ہوتے ہیں اور جوانی میں ہی کئی بیماریوں کے مریض بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی جہنم کی زندگی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف امیروں، نواب زادوں، صاحبزادوں اور پیرزادوں کے محلات میں وہ بچے ہیں جن کی آؤ بھگت کے لئے فوج ظفر موج ہے۔ کوئی بچے کو نہلانے پر مقرر ہے کسی کی ڈیوٹی بچے کے بوٹ پالش کرنا ہے۔ کوئی سیر کرانے کا ملازم ہے۔ اس طرح ایک نازونعم کا ماحول اس کی ابتدائی زندگی کی نشوونما کرتا ہے۔ بچے کی تعلیم پر لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ ہر سال اس کی سالگرہ پر ہزاروں روپیہ کی دعوتیں اڑائی جاتی ہیں۔ اور اگر وہ کبھی ان محلات میں فیشن کے طور پر روزہ رکھ لے تو اس کے روزہ افطار کرانے پر دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اخبار میں افطاری کی تقریب کی تصاویر بھی شائع کرائی جاتی ہیں۔ ابھی چند دن بعد رمضان کا مہینہ آئے گا اور آپ یہ سب کچھ اخبارات میں دیکھ لیں گے۔

صاحب صدر! لاہور ہی کے ایک محلے کا حال یہ ہے کہ رات کے وقت ان کے گھروں سے ان کے بچوں کی چیخوں اور کراہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ ان کی مائیں انہیں مار پیٹ کر سلاتی ہیں۔ لیکن نیند بھی تو خالی پیٹ قریب نہیں آتی۔ اور اسی طرح رات رو دھو کر گذر جاتی ہے۔ وہ لوگ چپ چاپ بھوک کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ وہ ان امراء سے اپنا حق کیوں نہیں مانگتے؟ — کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی روزی کا اس دنیا میں کوئی انتظام نہیں کیا، اور اگر نہیں کیا تو پھر کیا اللہ تعالیٰ نے (معاذ اللہ) یہ تماشہ دیکھنے کے لئے ان کو اس دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ بھوک کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس دنیا سے اٹھا کیوں نہیں لیتا؟ وہ ان امراء سے اپنا حق اس لئے نہیں مانگتے کہ پاکستان میں یہ تصور عام کر دیا گیا ہے کہ رزق کی کنجی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ اور اس کے سامنے کسی کا کوئی بس نہیں چل سکتا — یہ تصور ان دین فروش ملاؤں نے دیا ہے جن کے تصورات برسر اقتدار سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو تقدیر کے چکر میں پھنسا رکھا ہے اور خود سرمایہ داروں سے زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات کی بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے ہیں۔ ان دین فروش ملاؤں نے دین کو مذاق بنا رکھا ہے — اور ان مفلوک الحال لوگوں کو تقدیر کے چکر میں پھنسا رکھا ہے۔ یہ لوگ اپنی روزی کے فکر میں گھل گھل کر مر جاتے ہیں اور ان کے جنازے کے ساتھ چلنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے ماتھے پر غربت کا نشان لگا ہوا ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں

کے اسی تقدیر پرستی کے عقیدے پر تنقید کرتے ہوئے غریب عوام کو کہا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے لئے خود جدوجہد کریں اور خود اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھیں۔ انہوں نے فرمایا۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

صدر محترم! ہمارے مکان کے ساتھ ایک مستری رہتا ہے۔ سارا دن ایک ورکشاپ میں کام کرتا ہے اور اس کے بعد گھر آکر لوگوں کے دروازے اور کھڑکیاں بناتا ہے۔ تب کہیں اس کو اور اس کے کنبے کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا ملتا ہے۔ اس مستری کے مکان کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا محل ہے، ایک سرمایہ دار کا محل جہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ پچھلے دنوں اس سرمایہ دار کی بیٹی کی شادی تھی۔ بیٹی کو جہیز میں کار، ٹیلی ویژن، فریج اور نہ جانے کیا کیا، مجھے تو ان کے نام بھی نہیں آتے، دیا گیا۔ اور ہر طرح کے پکوان پکے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ اس دعوت میں شامل ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان پکوان کی خوشبو اس مستری نے بھی سونگھ لی ہوگی جس کی تین بیٹیاں جوان ہیں اور اس کو یہ فکر لاحق ہے کہ وہ ان کے ہاتھ کس طرح پیلے کرے گا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب اس نے اس سرمایہ دار کی بیٹی کے جہیز کو دیکھا ہوگا تو اس کے احساسات کیا ہونگے۔

صاحبِ صدر! کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہ ملک قائداعظمؒ نے ان سرمایہ داروں کے لئے بنایا تھا یا ان مفلس و قلاش مسلمانوں کی زندگیوں کو سنوارنے کے لئے بنایا تھا۔ کہنے کو تو یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت ہے لیکن یہاں انسانوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے انسان صورت شیطان سیرت درندے دندناتے پھرتے ہیں۔ سفارش اور رشوت کا دور دورہ ہے اور لوگ مفاد پرستی کی وجہ سے حیوان بن چکے ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔ موجودہ معاشرے میں مفاد پرستیوں کے جال اس طرح پھیلائے گئے ہیں اور نفسا نفسی کا مرض اس طرح عام ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ مسلمانوں کی اس عظیم مملکت میں نئی پود حیران و پریشان کھڑی حالات کا جائزہ لے رہی ہے اور اس محشر میں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

نفسا نفسی بھی وہی، سچ کی دہائی بھی وہی
تیرا محشر میرا مانوس نظارہ نکلا

صاحبِ صدر! جس معاشرے میں تکلیفوں اور مصیبتوں کی حالت اس طرح کی ہو تو نئی نسل کا اضطراب خوفناک حد تک بڑھ جاتا ہے۔ اکثر مایوسی کے اندھیرے میں چلے جا رہے ہیں۔ کچھ مایوسی اور ناکامی کی دل ہلا دینے والی کراہوں کے ساتھ پکار رہے ہیں کہ "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟" ان کی اس آواز کا

جواب نہیں دے سکتا اس لئے کہ میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں مشاہدہ تو کیا جا سکتا ہے، نتائج اخذ نہیں کئے جا سکتے۔ یہ آپ بڑوں کی ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے تجربہ، علم اور حسنِ کردار سے اس سوال کا جواب دیں۔ والسلام!

(۰)

ثریا عندلیب

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

صدرِ محترم! عزیز بہنو اور بھائیو! السلام علیکم۔ روحِ غالب سے معذرت کرتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ

رکھیو میری قوم! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

تو سامعینِ کرام! اسے اپنی شامتِ اعمال کہا جائے یا انقلابِ زمانہ کا نام دیا جائے۔ اسے شومئی تقدیر سے تعبیر کیا جائے یا ناخن تدبیر کی تقصیر سمجھا جائے۔ اسے کچھ بھی سمجھا جائے۔ اس کے تعلق سے دل دھوکا کھاتا ہے تو کھائے۔ ذہن فریب کی چادر اوڑھتا ہے تو اوڑھتا رہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ حقیقت کبھی چھپا نہیں کرتی اور آج یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ آثارِ سحر کی تو بیسویں صدی کے بعد نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرنے کا عزمِ صمیم کرتے ہوئے زندگی کے سنگِ گراں کو اپنے تیشۂ عمل سے کاٹ کر جوئے شیر برآمد کر لانے کا یقین رکھنے والے رہروانِ ہم قدم کے لبوں پر یہ فریاد آگئی کہ "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟"

مگر میں نے اسے فریاد کیوں کہا؟ یہ تو اس نازک ترین وقت کا وہ اہم ترین اور عبرت انگیز سوال ہے جو ہمارے دل و دماغ پر ہر آن تازیانے لگا رہا ہے۔ جو ہر صاحبِ ہوش و حواس اور تمام مدعیانِ یقین و ایمان سے اپنا واضح اور دو ٹوک جواب چاہتا ہے۔ کیسا سخت مقام ہے یہ کہ اس وسیع و عریض زمین کے اوپر اور کشادہ و فراخ آسمان کے نیچے مسلمان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہے اور وہ در بدر خاک بسر زندگی کے لاشے کو گھسیٹتا چلا جائے۔ کسی تنکے کی طرح کمزور و بے مایہ جسے تیز ہوا کے جھونکے اِدھر سے اُدھر اڑائے پھرتے ہیں۔ کیسا ناقابلِ فہم ہے یہ زوالِ امتِ عزیز کا جو چشمِ فلک نے دیکھا، جو چشمِ فلک ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھے چلی جا رہی ہے۔ کس قدر تاسف انگیز و تحیر آمیز ہے یہ حال پُر ملال اس انبوہِ کثیر کا جسے مسلمان کہتے ہیں اور جو بظاہر تمام دنیا میں یہاں سے وہاں تک پھیلا نظر آتا ہے۔ مگر جو کروڑوں اربوں کی تعداد رکھتے ہوئے بھی سرفرازیوں و سربلندیوں سے محروم مورِ بے بال و پر کی مانند پست و حقیر ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ مسلمان ہوتے ہوئے یہ نکبت و زبوں حالی، یہ ذلت و رسوائی چہ معنی دارد؟ اسلام کے نام لیوا ہو کر یہ تباہی و بربادی یہ ویرانی و خانماں خرابی

کیونکر مقدر ہو گئی۔ قرآنِ حکیم کے حاملین کے نصیب میں بے بسی و بے کسی کی پستیاں کیسے آگئیں جبکہ اس کتابِ عظیم کا وعدۂ حق یہ تھا، یہ ہے اور یہ رہے گا کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۶/۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انہوں نے ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا، ان کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ پر گامزن رہیں گے۔ اور قرآن اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور ہمارے اوپر حق ہے مومنوں کی مدد کا۔ قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہوگا۔ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ خدا کفار کو مومنین پر غالب آجانے دے۔ اور قرآن کا یہ فرمان بھی اٹل ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ یعنی اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائیں اور اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین میں حکومت عطا کرے گا، اور یہ کہ ان کی حکومت اس خطۂ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی (۲۴/۵۵) یہ وہ آیاتِ جلیلہ ہیں جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک بندۂ مومن یعنی مسلمان کا حق و اختیار کیا ہوتا ہے اور اسے کس انعام و اکرام کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اور تمہیں سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو۔ یہ ہے وہ ازلی ابدی بشارت جو مومن مسلمان کے لئے مخصوص کی گئی اور جس کی عملی و محسوس شکل اور حقیقی پیکر کو دنیا نے عہدِ رسالت مآب سرورِ کائنات حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ و خلافت راشدہ کے زمانے میں دیکھا۔ وہ تیئیس سالہ درخشندہ عہدِ نبوت جو بقول مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہے۔ یہ سربلندی و سرفرازی جو آنحضورؐ کی وساطت سے اور رہنمائی سے مومن کے حصے میں آئی، جاری و ساری رہنے کے لئے تھی۔ خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا۔ اور اس قلیل عرصے میں مسلمانوں کو وہ عزت و عظمت اور قوت و حشمت حاصل ہوئی کہ ترکستان سے بحرِ خزر تک اور افریقہ میں تونس تک پرچمِ اسلام لہرانے لگا اور روئے زمین پر کسی دوسری قوت کو امتِ مسلمہ سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ مگر یہ کام آسمانی رحمتیں اور زمینی برکتیں یہ سب فتوحات اور عظمتیں، مسلمان قوم کا کفار پر مکمل غلبہ اور تمکن فی الارض اس وجہ سے تھا کہ پوری جماعت ایک ڈوری میں بندھی ہوئی قرآنی نظام میں منسلک و لا الٰہ الا اللہ کی صحیح تفسیر تھی جس کی مرکزیت خلیفہ کی ذات میں تھی جس کی وجہ سے افرادِ ملت کے ملی مقاصد متعین تھے اور ساری امت ایک محور پر گھومتی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے بعد کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ صراطِ مستقیم

پر چلتی ہوئی یہ گاڑی ادھر اُدھر کچی پگڈنڈیوں پر ہچکولے کھانے لگی۔ تصویر کا رُخ بدل گیا، روشنی پر تاریکی غالب آ گئی۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ مسلمان نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔" اگر تم مومن ہو" کے نقطۂ ماسکہ سے اپنی نگاہیں ہٹالیں اور اس کی لَم کو یکسر فراموش کر دیا جس کا نتیجہ صدیوں سے یہ دنیائے ارض و سماوات دیکھ رہی ہے اور جس نے رفتہ رفتہ آج ہمیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ در و دیوار تک پکار اٹھے۔ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔

— یہ پکار اور کوئی سنے یا نہ سنے، اس سوال کا جواب اور کوئی دے یا نہ دے، بہرحال ہمارا یہ اجتماع قرآنی جو گزرے سالوں کی طرح سالانہ کنونشن کے موقع پر آج بھی احتساب خویش کے لئے مل بیٹھا ہے، یہ ذمہ داری اٹھانے کا متقاضی ہے کہ چشم بصیرت وا کرتے ہوئے اپنے ماضی و حال کا جائزہ لے اور اپنے قول و عمل کا تجزیہ کر کے یہ بتا سکے کہ اب مسلمان نے کدھر جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ برعکس اس کے زمانہ کی حکایتیں بیان کرنے اور گردش فلک کی شکایتیں کرتے چلے جانے سے وقت کی بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، نہ ہی اپنی تباہ حالی کا مداوا گریہ و فریاد اور آہ و زاری میں مل سکتا ہے۔ شمع ہدایت ہاتھ میں رکھتے ہوئے کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہنے سے بڑھ کر بھی کوئی بدبختی ہو گی۔ پھر اس حقیقت سے مجالِ انکار کیسے ہو سکتی ہے کہ

یوں تو دنیا میں مسلماں کا کوئی دوست نہیں
لیکن افسوس کہ یہ خود بھی ہے دشمن اپنا

یہ اپنے آپ سے دشمنی ہی تو اس زوال و انحطاط کی بنیاد ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ دوچار رہی اور جس کے نواتب نے جسدِ ملّت کو کھوکھلا کر دیا۔ اس کا ثبوت کہیں باہر سے مہیا کرنے اور اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے وطنِ عزیز کی اپنی سرزمین پاک میں اپنے معاشرے کا چلن اس بات کی زندہ شہادت اور اس کا بیّن ثبوت ہے جہاں مجموعی طور پر جماعتی صورت میں بیتے ہوئے ماضی اور گزرتے ہوئے حال میں ایمان و ایقان اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے کوئی فرق و امتیاز نظر نہیں آتا۔ کیونکہ لا الٰہ الّا اللہ کو مقصد زندگی بنا کر آزادی کی نعمت حاصل کرنے والوں نے محمد رسول اللہ کو طرز زندگی بنانے کی توفیق حاصل نہ کی۔ چنانچہ صدیوں کی غلامی سے نجات دلانے والے رہبر کی آنکھ بند ہوتے ہی آزادی کا حقیقی مفہوم بھلا دیا گیا اور یوں دنوں کے اندر وہ قوم جو ایک ہو کر دنیا کے سامنے آئی تھی بیسیوں جماعتوں میں بٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وحدتِ ملّت کا شیرازہ بکھر گیا اور اتفاق و اتحاد کی دیوار مسمار ہو گئی۔ آزادی کی نعمت سے فیضیاب ہو کر اور آزاد مملکت کا عطیہ خداوندی حاصل کر کے مسلمان کا قانونِ خداوندی سے منہ موڑ لینا اور اس ایمان و عمل سے رشتہ توڑ لینا جس کا عہد و پیمان اس نے خدا اور رسول کے ساتھ کیا تھا، انسانیت کا ایسا سنگین المیہ ہے کہ دنیا میں اس کی مثال

نہیں مل سکتی۔ اس صورتِ حال کے تحت یوں تو سارا عالمِ اسلام ہی اپنے ہاتھوں لائی ہوئی محرومیوں اور مایوسیوں میں مبتلا ہے لیکن ہمارا معاملہ اس لئے سب سے سوا ہے کہ ہم نے اپنے پاکستان کو اس دعویٰ کے ساتھ قائم کیا تھا کہ یہ ایک ایسا خطۂ زمین ہوگا جو تجربہ گاہ بنے گا اس اسلامی نظام کے احیاء کا جو عہد محمد الرسول اللہ والذین معہ میں وجہِ شادابیٔ عالم ہوا تھا۔ اس مملکت میں بسنے والے تمام مسلمان اشتراکِ ایمان کی بنا پر ایک قوم یعنی امتِ واحدہ قرار پائیں گے۔ وہ امت جس میں رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی تفریق، صوبائی تقسیم، ذات برادری کے غیر فطری امتیازات باقی نہ رہیں گے۔ دنیا ایک دفعہ پھر اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کا جنت نگاہ نظارہ دیکھے گی۔ اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوگا جو رفتہ رفتہ مسلمانوں کو اس بلند مقام پر لے آئے گا جہاں کسی قسم کے تفرقہ کے شرک کی رسائی نہ ہو سکے گی۔ اور بالآخر یہ کامیاب تجربہ دنیا کے دیگر ممالک کے لئے ایسا شاداب نمونہ بن سکیگا کہ جس کی بدولت ساٹھ ستر کروڑ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے نفوس پھر سے رشتۂ اخوت میں بندھ کر بنیانٌ مرصوص بن جائیں گے جس کے ساتھ کفر و باطل کے سر ٹکرائیں گے اور پاش پاش ہو جائیں گے ــــ مگر کیا سہانا خواب تھا جو ہم نے دیکھا اور کیسی بھیانک تعبیر ہے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ؎

اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو

ایک وہ ۲۳ سالہ عہدِ زریں تھا جو ذاتِ اقدس و اعظم رسول اکرم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں گویا ۲۳ موتیوں کی مالا کی صورت میں زمانہ کی گردن کے لئے باعثِ تزئین ہوا۔ ان گہرہائے آبدار کی لازوال چمک دمک اہلِ زمانہ کو صاف اور سیدھے راستے پر گامزن رکھنے کے لئے تھی۔ اور منشائے ایزدی یہ تھا کہ اس راہِ حق کو اختیار کرنے والوں کو کسی بھی مرحلہ حیات پر اس شکستگی کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ وہ راستہ بھٹک کر اپنی منزلِ کھو بیٹھیں۔ چنانچہ مومنین کو یہ نوید دی گئی کہ

اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ۔

تم قطعاً خوف نہ کھاؤ اور کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرو۔ تم نہ افسردہ خاطر ہو نہ اداس اور غمگین۔ تمہارے لئے اس جنتی زندگی کی بشارتیں ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ تمہاری اس دنیا کی زندگی میں بھی ہم تمہارے رفیق ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی معین و مددگار۔ اس میں تم جو چاہو گے وہ ہوگا جو مانگو گے

ملے گا۔ یہ اس لئے کہ تم نے صحیح راستہ اختیار کیا اور ان نقوشِ قدم کا اتباع کیا جو دنیا اور آخرت دونوں میں حیات افروز خوشگواریوں کے ضامن اور بہار آفریں شادابیوں کے کفیل ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ اس ازلی و ابدی پیغام حیات کی موجودگی میں ضابطۂ خداوندی کو تھامتے ہوئے بھی ہم نے منشائے ایزدی کو پورا نہ کیا۔ ماضی جو گزرا تو وہ سراسر داغدار۔ اس کی تفصیل میں جانے کی تو اس مختصر وقت میں گنجائش نہیں لیکن اپنا حال، تصویر ملال تو سب کے سامنے ہے۔ پاکستان کا یہ تیئیس سالہ دور جس کی برائی بھلائی کی تمام تر ذمہ داری ہماری اور صرف ہماری ہے اور اس سے فرار کسی طور بھی ممکن نہیں۔ مگر ہم اس حالت میں پہنچ گئے ہیں کہ لمحہ بہ لمحہ، ساعت بہ ساعت معاشرے میں برائیوں کو فروغ مل رہا ہے۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغا بازی، کا بازار گرم ہے۔ رشوت ستانی، حرام خوری، خوشامد، تملق، اقربا پروری، احباب نوازی کی لعنتیں مسلط ہیں۔ نااہلی، غلط اندیشی۔ تساہل انگاری، وعدہ خلافی، کام چوری، ملت فروشی، خود غرضی، خود ستائی، ہوس پرستی، زر اندوزی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اخبارات روزانہ معاشرے کے زخمی اور لہو لہان جسم کو سجا سجا کر پیش کر رہے ہیں۔ چوری، ڈاکہ، قتل و غارت، روز کا معمول بن چکے ہیں۔ ظلم و بے انصافی کے لئے میدان صاف ہے اور ہم اندھوں کی طرح دیکھ رہے ہیں اور بہروں کی طرح سن رہے ہیں۔ کیا ہم نے زمین کا یہ ٹکڑا اس لئے حاصل کیا تھا کہ اسے انسانوں کا مامن بنانے کی بجائے درندوں کا مسکن بنا دیں؟ کیا یہ اسی لئے وجود میں آیا تھا کہ ہر چھوٹا بڑا مادر پدر آزاد ہو کر قانون و قاعدے سے بے نیاز ہو جائے، کیا یہ اسی خاطر ہمیں ودیعت ہوا تھا کہ اس کے بعد نہ پھر ہمیں کسی آئین کی ضرورت ہو نہ ہمارے لئے کوئی نظام لازم ہو۔ واحسرتا۔ گزشتہ ۲۳ برس کی تاریخ میں جو کچھ نہ ہونا تھا وہ کیا گیا اور جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا جس پاکستان نے مسلمان کے لئے دارالامان بننا تھا اس پاکستان کا مسلمان زمین و آسمان سے یہ پوچھتا پھرتا ہے کہ وہ کدھر جائے۔ اسی خطۂ پاک میں اسے ایک طرف فلک بوس محلات میں دا دِ عیش دیتے نفوس نظر آتے ہیں تو دوسری طرف وہ سایۂ دیوار کو بھی ترستی ہستیاں دیکھتا ہے۔ ایک طرف انواع و اقسام کے لذیذ پکوان سے شکم سیر افراد دندناتے پھرتے ہیں تو دوسری طرف نانِ جویں کو محتاج بندے سسک رہے ہیں — دائرہ اسلام کے اندر رہتے ہوئے یہ تضاد یہ تفاوت! داروں اور ناداروں کے دو طبقے۔ یہ پارٹی بازی یہ سیاست! — بار الٰہا! — تو ہی بتا اب تیرا مسلمان کدھر جائے؟

تاہم یہ وہ سوال نہیں جس کا جواب نہ مل سکے۔ یہ وہ عقدہ نہیں جس کا حل نہ ہو سکے۔ وہ تو چودہ سو سال سے ہر دور میں موجود رہا ہے۔ وہ تو ہر وقت ہمارے پاس موجود ہے اور ہر آنے والے زمانے میں موجود رہیگا۔ ہاں مگر اس سلسلے میں اس وقت ہمارے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلتی اور کردار تشکیل پاتے ہیں۔ آج رونے کی بات یہ

نہیں کہ ہمارا اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے پستیوں میں گرا ہے یا نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط سے عاری ہے۔ بلکہ مقامِ گریہ یہ ہے کہ نہ قوم کی موجودہ نسل کو صحیح تعلیم مل رہی ہے نہ آنے والی نسل کی وحی خداوندی کی رُو سے انسانیت کو ملی ہوئی زندگی کی اقدار کی روشنی میں تعلیم و تربیت دیئے جانے کا کوئی انتظام نظر آتا ہے۔ اور یاد رکھیئے کہ یہ وہ گوشہ ہے جس سے تغافل برتنے پر قدرت کبھی ہمیں معاف نہیں کرے گی۔ کیونکہ اگر آنے والی نسل ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی رہی تو پھر یہ سرزمین بے آئین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ نہ ہی کبھی اس مسلمان کو اپنی منزل مل سکے گی۔ وہ یونہی بھٹکتا پھرے گا اس فریاد کے ساتھ کہ کوئی بتلائے کہ میں کدھر جاؤں۔ یہ وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جسے قرآنِ کریم نے ایسے واضح انداز میں بیان کیا ہے جسے دیکھ کر روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسولؐ کی اس آواز پر لبیک کہو جو تمہیں ایک حیات بخش نظام کے قیام کے لئے دعوت دیتی ہے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو وَ اتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّۃً وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ تو پھر تم اس فتنہ سے ڈرو جو جب آیا کرتا ہے تو انہیں لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتا جو ظالم اور غاصب تھے بلکہ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو کے قانونِ مکافات کا مواخذہ بڑا سخت ہوتا ہے۔

حاضرینِ گرامی قدر! اس اظہارِ خیال کا خلاصہ اپنے مشفق و محترم باباجی کے گرانقدر الفاظ میں بیان کرنے کی اجازت چاہتی ہوں کہ اس کے سوا اور کچھ کہا نہیں جا سکتا اور وہ یہ ہے کہ پاکستان اور قرآن کا رشتہ ارتباطِ لفظ و معنی اور اختلاطِ جسم و جان کا سا ہے۔ اس سے قرآن کو جدا کر دینے کا مطلب یوں سمجھئے جیسے سورج سے روشنی اور حرارت کو الگ کر دیا جائے۔ اس کے بعد یہ زیادہ سے زیادہ بے جان پتھروں بے برگ و گیاہ صحراؤں اور بھیانک غاروں کا نگاہ فریب چاند بن کر رہ جائے گا۔ انسانیت کے لئے زندگی اور روشنی کا سرچشمہ نہیں بن سکیگا۔ پاکستان کے وجود کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان قرآن کو اپنا راستہ سمجھے اور قرآن سے اپنی منزل پائے۔ وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔

خالد محمود سعید

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

صاحبِ صدر، اور حاضرینِ کرام! السلام علیکم۔ مجھے اس اجلاس میں کچھ کہنے کا جو موقع دیا گیا ہے وہ

بڑی عزت افزائی ہی نہیں مشکلکشائی بھی ہے۔ ایک عرصے سے میں بزرگانِ قوم سے کچھ کہنے کو بیتاب تھا۔ الحمد للہ کہ محترم باباجی نے مجھے اس قابل سمجھا اور اب میں چند لمحوں کے لئے آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

تمہیداً مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شعوری بلوغت کے شروع دنوں ہی سے میں نے اپنے آپ کو ایک گمشدہ [illegible] محسوس کیا جو اپنے ماحول کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور چند سوالوں کے جوابات چاہتا تھا۔ مثلاً :—　میں کون ہوں ؟

میں کہاں سے آیا ہوں ؟

میں کہاں جا رہا ہوں ؟ — وغیرہ۔

میں حتی المقدور ان سوالوں کے جواب تلاش کرتا رہا ہوں۔ کچھ ملے، کچھ نہ ملے، اور جو ملے ان کا بھی یہ عالم کہ ہر جواب دوسرے سے بالکل الگ۔ اس سے جو ذہنی کشمکش پیدا ہوئی اُس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے سامنے کتابوں کی شکل میں علم کا ایک بحرِ ذخار موجیں مار رہا تھا لیکن وہ صدف ہاتھ نہ آتا تھا جس نے ایک قطرۂ نیساں کو گہر کیا ہو۔

بہرحال آمدم برسرِ مطلب، فلسفیانہ مباحث سے قطعِ نظر میرے سامنے بہت سے مسائل عملی زندگی سے متعلق بھی تھے۔ اُن میں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی کہ کوئی دو جواب آپس میں نہیں ملتے تھے۔ میری اس علمی جستجو میں میرے ساتھ جو بیتی وہ ایک الگ کہانی ہے سرِدست مجھے ایک پریشانی ہے اور میں مملکتِ خداداد پاکستان کے ایک نوجوان فرزند کی حیثیت سے قوم کے بڑے بوڑھوں سے ملتجی ہوں کہ اس مشکل میں میری رہنمائی فرما دیں۔

انسانی معاشرے میں بالعموم اور پاکستانی معاشرے میں بالخصوص جو شے مجھے پریشان کئے ہوتے ہے وہ ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ ہم میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔

اپنے ماحول میں کوئی متنفس ایسا نہ ملا جس نے جھوٹ بولنے کو پسندیدہ قرار دیا ہو۔ بُرے سے بُرے کردار کا شخص بھی سچ کی بڑائی کا اقرار کرتا ہے، مگر زبانی زبانی۔ اپنی زندگی میں میں نے یہ تلخ حقیقت بڑی شدت سے دیکھی کہ شاید ہی کسی ایسے انسان سے ملاقات کی ہو جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ کم و بیش ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی دور میں تھوڑی بہت غلط بیانی سے ضرور کام لیتا ہے اور بعض اوقات تو جھوٹ بول کر بڑے بڑے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں اور پھر — لطف یہ ہے کہ — چین کی نیند سویا جاتا ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ سنا کہ ہمارا اخلاق بہت اچھا ہونا چاہیئے۔ بڑوں کو چاہیئے کہ وہ چھوٹوں سے شفقت برتیں اور چھوٹوں کو لازم ہے کہ وہ بڑوں کی عزت کریں۔ اور برابر والوں کے لئے ضروری ہے کہ آپس میں محبت سے

پیش آئیں، لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہوتا بالکل اس کے اُلٹ ہے۔ یعنی بڑے شفقت کا اظہار نہیں کرتے اور چھوٹوں کے نزدیک بڑوں کی عزت و احترام کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور ہم عمر لوگوں سے ہمارا برتاؤ دشمنوں اور حریفوں جیسا ہوتا ہے۔ کہنے اور کرنے میں یہ جو فرق ہے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؛ کسی سے کچھ کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے کہ "صاحب! آج بھلائی کا زمانہ نہیں ہے۔ اس دور میں یہ باتیں نہیں چلتیں۔" یہ جواب کم سے کم میری تشفی تو نہیں کر سکتا۔

اسی طرح میں روزِ اول سے یہ سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہمیں لازم ہے کہ غریب و مسکین اور نادار لوگوں کی گاہے بگاہے مدد کرتے رہیں۔ کسی سوالی کو ٹھکرانا نہایت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مفلس کا تونگر کے مال میں حق ہے اور زر والے کا فرض ہے کہ اس کی حاجت رفع کرے۔ مال دار اور مفلس دونوں ایک دوسرے کے بھائی بند ہیں۔ اور ایک بھائی پر لازم ہے کہ دوسرے کی مدد کرے۔ لیکن عملی زندگی میں جو صورتِ حالات نظر آتی ہے وہ اس نظریئے کے بالکل خلاف ہے۔ مفلس رنادار اور اپاہج کے قریب سے ہو کر تونگر گزر جاتا ہے۔ معاشرے میں ایک بے یار و مددگار شخص کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے اور اس کی پکار کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور جب کبھی صاحبِ استطاعت لوگوں کی توجہ اس بات کی طرف کرائی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں "جناب! اب وہ پہلی طرح کے اصلی فقراء و مساکین کہاں رہے۔ یہ تو سب بنے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی ہفتہ وار آمدنی ایک کلرک کی ماہانہ آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ تمام لوگ غیر مستحق ہیں۔"

تو بھائی وہ پیمانہ ہی بتا دیجئے جس سے مستحق اور غیر مستحق کی تمیز ہو سکے! لیکن باقی تمام سوالوں کی طرح اس مسئلے کا بھی کوئی حل نہیں ملتا اور مجھ جیسا انسان حیران کھڑا رہ جاتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔

اس نوع کی مثالیں تو ہزاروں کی تعداد میں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن وقت کی قلت مجبور کرتی ہے کہ چند ایک پر ہی اکتفا کیا جائے۔ چلتے چلتے ایک مثال اور پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

بچپن اور لڑکپن میں سکول کی کتابوں میں پڑھا کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی برائی ذات پات کی تقسیم ہے۔ اس پہ انہیں حد درجہ مطعون کیا جاتا ہے۔ بزرگوں کو ہمیشہ یہ کہتے سنا گیا ہے کہ اسلام عالمی بھائی چارے کا علمبردار ہے۔ یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس عظیم پیغام نے دنیا سے ذات پات کی لعنت کو مٹا دیا ہے۔ اور امیر غریب، چھوٹے، بڑے کا امتیاز ختم کر دیا ہے۔ اس دین قیم کی رُو سے فضیلت سیرت و کردار کا حاصل ہے، نسلی اور خاندانی تفاخر کو نہیں۔

مگر ـــــ اس حدیثِ خونچکاں کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عملی طور پر اس نظریہ کا استرداد کیا جاتا ہے۔ اور ہم اسے اپنے روزمرہ معاملات میں پرِکاہ کی بھی حیثیت نہیں دیتے۔ ہم ذات پات کی وجہ سے

انسانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اُن کی ذات چھوٹی ہونے پر طعنے اور ذات بڑی ہونے پر داد و تحسین دیتے ہیں۔ ہم شادیوں کے سلسلے میں اچھے رشتے محض اس لئے ٹھکرا دیتے ہیں کہ "ذات دوسری ہے"۔ ہزاروں کی تعداد میں معاشرے کی بیٹیاں محض اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ اُن کی ذات کا کوئی آدمی آکر ان کی خواستگاری کرے۔ کوئی خدا کا بندہ ذرا رُک کر یہ نہیں سوچتا کہ انسانی ذات سے بڑھ کر کس ذات کا ہونا ضروری ہے۔ بزرگانِ محترم ذرا غور فرمایئے:

معاشرہ کہتا کیا ہے اور کرتا کیا ہے؟

قول و فعل کا یہ تضاد ہماری روزمرہ کی معاشرتی زندگی کے علاوہ مذہبی دائرے میں بھی پورے شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ ہم قدم قدم پر اپنی اس دیدہ دلیری کا ثبوت دیتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ کوئی بھی ایک لمحے کے لئے اس بات پر غور نہیں کرتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟

یہ اور اسی قسم کی کئی اور باتیں ہمیشہ ہی سے مجھے ذہنی کچوکے لگاتی رہی ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ:

ہمارا نظریہ درست ہے یا عمل؟

کہنا صحیح ہے یا کرنا؟

سچائی آخر کہاں ہے؟ صراطِ مستقیم کدھر ہے؟

معزز حاضرین! میں آہستہ آہستہ ان تمام عقاید اور مسلّمہ نظریات سے بددل ہو کر دور ہوتا چلا گیا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں جو عقیدہ یا نظریہ عملی زندگی میں بارور نہیں ہوتا وہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام نہیں ہو سکتا۔ میں نے بزرگانِ قوم! لاالٰہ کی تمام منزلیں قطع کر لی ہیں۔ اب آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے الا اللہ کا راستہ دکھایئے۔ اگرچہ میں اپنے ماحول سے بہت بددل ہوا ہوں لیکن اس کائنات اور اس میں جاری و ساری زندگی سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اُس سیدھے راستے کی تلاش ہے جس پر چل کر انسان اپنی حقیقی منزل تک پہنچ سکتا ہے

میں اس مملکتِ پاکستان کا ایک نوجوان شہری ، اس پاکستانی قوم کا BRUTUS ہوں۔ میں نے غلط اور گمراہ کن عقیدوں اور نظریات اور تضادات کے CEASRE کے سینے میں اپنے افکار کا خنجر اتار دیا ہے۔ اور اب ـــــ بزرگانِ قوم کے اس اجتماع میں حاضر ہوں۔ یہ بتانے کے لئے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اور یہ پوچھنے کے لئے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

BRUTUS کی طرح چند لمحے رُک کر، میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کہ میری مشکل کا حل کیا ہے؟

للہ، کوئی تو کچھ جواب دے ـــــ!

(۰)

غلام صابر
(ایم - اے اردو) (ایم - اے فارسی)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

جناب صدر! معزز حضرات۔ ہم خوش بخت ہیں جو تاریخ انسانیت کے اس دور میں پیدا ہوئے ہیں جب رموز کائنات پر پڑے ہوئے پردے ایک ایک کرکے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ انسان، تسخیرِ فطرت کی عظیم الشان جدوجہد کا آغاز کر چکا ہے۔ شرفِ انسانیت کی بارگاہ میں داخل ہو رہا ہے اور فطرت کی قوتیں، اس کے سامنے محو نیاز ہیں۔ فطرت اپنے منتہا کو پا رہی ہے اور انسان اپنی منزل کی جانب پہلا قدم بڑھا رہا ہے۔ اس حسین منظر نامے میں دیکھنا یہ ہے کہ اس کائنات میں انسان تو یہ کچھ کر رہے ہیں، لیکن انسانوں ہی سے بزعم خویش بلند تر انسان جنہیں مسلمان کہا جاتا ہے، وہ کس مقام پر ہیں، اور ان کی زندگیاں کیسی ہیں ــــ ان کی منزلیں کیا ہیں اور ان کے مقاصد کیا ــــ! یہ ایک وسیع موضوع ہے۔ اور مسلمان کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی کیفیت اور پھر بین الاقوامی صورتِ حال میں ایک بڑے گروہ کی حیثیت سے، اس موضوع پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں چونکہ مسلمان اپنی انفرادی سطح پر، اجتماعی طور پر اور بین الاقوامی حیثیت سے، نہ ورنہ پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے اس لئے "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے" کے موضوع پر اظہار خیال کرنا وقت کی آواز کو پہچاننے اور اجڑے ہوئے آشیاں کی تعمیر نو کرنے کے مترادف ہے ظاہر ہے کہ اجڑے ہوئے آشیاں کی مرثیہ خوانی بھی حسیات پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن میں اپنے اظہار خیال میں مرثیہ خوانی سے ہٹ کر حقائقِ زندگی کی الجھنوں کے تذکرہ کو فوقیت دوں گا۔ تاکہ اپنی الجھنوں کا جذباتی تجزیہ کرنے کی بجائے، حقیقی اور واقعاتی انداز سے سوچا جا سکے ــــ یہی انداز قوموں کے لئے زندگی کی علامت ہوا کرتا ہے۔

حضرات! ہمارا یقین ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے اس یقین کو بنیاد بناتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیا کے دوسرے انسانوں سے اپنے آپ کو بلند تر سمجھتے ہیں ــــ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری زندگی کے عملی مظاہر انفرادی طور پر اور اجتماعی حیثیت سے ہمارے مسلمان ہونے پر دلالت کرتے ہیں ــ! اس کا جواب کچھ بھی ہو لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا میرے خیال میں ضروری ہے کہ جب تک نظام معاشرت کی بنیادوں میں تبدیلی کر کے خارجی صورتِ حال تبدیل نہیں کی جاتی "اس وقت تک انفرادی سطح پر ہم اپنے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ انسان جب اپنی ذات یا خودی کی نشوونما، مستقل اقدار کے مطابق کرتا ہے تو اس انسان کی زندگی کو ہم مسلمان کی زندگی کہتے ہیں ــــ ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکنا چاہیئے کہ آیا ہماری زندگی مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کیا اس کے لئے ہم نے کوئی سعی و کاوش کی ہے ــ اور اگر نہیں تو پھر یہ سوچنے سے پہلے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے ـــ اپنی صفوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ عظیم الشان جد وجہد ہماری ذمہ داریوں میں سے اہم ذمہ داری ہے۔ ہم جو قرآن کی مستقل اقدار کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگیوں کا مقصد سمجھتے ہیں، اور دل و دماغ کی گہرائیوں سے اُن کی حقانیت پر یقین محکم رکھتے ہیں ـــ اگر ہم نے اپنے فرائض کی بجاآوری میں اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ میں بیچ دیا ہے تو پھر یہ فضا یقیناً ایک نہ ایک دن اپنے خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی ـــ تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور اندھیرے ختم ہو جائیں گے۔

صاحب صدر! ہماری اس تگ و تاز کی مخالفت میں اگرچہ بہت سی قوتیں ہیں لیکن وہ قوت جس نے دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا ہے اور جس نے قرآن کو اپنے کاروبار کا ذریعہ بنا رکھا ہے، وہ مذہبی پیشوائیت ہے اور ہماری اس جدوجہد میں ایک سنگِ گراں کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملائیت کا زہر جن قوموں کی زندگیوں میں سرایت کر جاتا ہے تو پھر وہ قومیں خودگری اور خودنگری کے اوصافِ حمیدہ سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ ہم مسلمان ـــ جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں ـــ اس ملائیت کے زہر سے آزاد نہیں ہیں ـــ ہم لاکھوں کی تعداد میں نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں ـــ لیکن وہ محسوس نتائج پیدا نہیں ہوتے جو صدرِ اول کے مسلمانوں نے پیدا کر کے دکھائے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دین محض شاعری بن کر رہ گیا ہے۔ اور نماز روزہ کی حیثیت دوسرے مذاہب کی طرح ایک مقدس رسم بن چکی ہے ـــ ہماری نمازوں اور ہمارے سجدوں سے دلوں میں تبدیلی تو پیدا نہیں ہوتی ـــ بلکہ اپنے تئیں ایک مقدس خود فریبی میں اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں ـــ اور حقائق کا مقابلہ کرنے کی جرأتوں سے محروم ہو جاتے ہیں ـــ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی اس افسوس ناک صورتِ حال کو بڑی دلسوزی سے محسوس کیا اور نہایت سادہ اور نہایت دردمندی سے کہا کہ ؎

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی، میں بھی نمازی

حضرات! تقلید پرستی کی وجہ سے نہ صرف افراد کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں، بلکہ جب یہ مرض عام ہو جاتا ہے تو معاشرے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ افراد ماضی کے دھندلکوں میں سوئے رہتے ہیں ـــ نئی پود مستقبل کے اندھیروں میں خود کو اندھا محسوس کرتی ہے اور ماضی و مستقبل کا سنگم۔ حال، ایک جامد پتھر کی مانند سنگِ راہ محسوس ہوتا ہے ـــ آج جن فضاؤں میں پاکستان کی نئی پود پروان چڑھ رہی ہے، اس کا خمیر یا تو ماضی کے دھندلکوں سے تیار کیا گیا ہے، یا مستقبل کے اندھیروں سے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حال کے جامد ہونے پر اضطراب موجود ہے ـــ اس اضطراب کو صحیح اور حقیقی سکون میں تبدیل اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ماضی پرستی کی تباہ کاریوں کے پیدا کردہ نتائج سے آگہی نہیں ہو جاتی ـــ اس

آگہی کے بموجب کھوئی ہوئی شے کی جستجو کی جائے گی تو پھر یہ لالہ کی وارث قوم اپنی کفِ دست سے ایسی نورانی شمع کا اہتمام کرے گی جو ہمیشہ کے لئے اندھیروں کو نیست و نابود کر دے — یہ اپنی ولولہ آفریں جرأت مندانہ ہمت سے نہنگوں کے نشیمن کو، اس طرح تہ و بالا کرے گی کہ دریا کی موجوں میں صحیح اور حقیقی سکون آجائے گا۔ اور انسانیت اپنی منزل کی جانب محوِ خرام ہو جائے گی۔

حضرات! یہ پاکستانی قوم کی خوش بختی ہے کہ ابھی وہ روشنی کے مینار موجود ہیں جنہوں نے اس ارضِ پاک کو اپنی آرزوؤں کا منتہا قرار دے لیا تھا — راستے میں مذہبی پیشوائیت کے بڑے بڑے سنگِ گراں آئے۔ لیکن ان کا جنونِ محبت، ملائیت کی شاطرانہ اور عیارانہ چالوں پر غالب آیا۔ اور جب فرعونیت نے ان کو اپنے قہر سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی تو اس نازک دور میں اس لالہ کی وارث قوم نے محمد علی جناح کو اپنا قائداعظم تسلیم کر لیا — قائداعظم کی جدوجہد ثمر بار ہوئی اور پاکستان وجود میں آگیا — آرزوئیں پوری ہوگئیں — لیکن اس گلستان سے "کچھ دلوں کو خدا واسطے کا بیر تھا" — وہ مذہبی پیشوائیت کے روپ میں اس گلستان میں گھس آئے اور شکست خوردہ ذہنیت کو مقدس نعروں میں چھپا کر نقب زنی شروع کر دی۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے طبقے کی نمک حلالی کرتے ہوئے بے حد و نہایت ملکیت کو اسلامی کہنے لگے۔ لیکن قائداعظمؒ کے ساتھیوں نے ان کا اس محاذ پر بھی پیچھا کیا اور کر رہے ہیں — ملائیت کے حربوں سے مسلمان نبرد آزما ہوتا جاتا ہے اور خطر پسند طبیعت رکھنے کی بدولت ہر آن، اپنا خون گرم رکھنے کا ڈھب آتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں!
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ملائیت اپنی حرکتوں سے پاکستانی قوم میں مایوسی پھیلانے کی سازش کر رہی ہے — مایوسی اور خوف کی فضا میں سے فلسفے نکال رہی ہے، اور نتیجہ کے طور پر قوم کا ایک حصہ ان کے دامِ فریب میں پھنس چکا ہے۔ اور ڈنڈا تنظیم قسم کی حرکتوں سے مایوسی اور خوف کو پھیلانے میں سرگرمِ عمل ہے۔ ملائیت اس جہاد میں کھلا کھلا کر ہنس رہی ہے۔ اس کے برعکس ملائیت سے بیزار طبقے کا ردِ عمل بھی اسی انداز کا مجنونانہ ہے — یہ درست ہے کہ اس کا جنون ان کے زندہ ہونے کی علامت ہے، لیکن پاکستان اور مسلمان قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اپنے جذبات کو اپنا الٰہ نہ بنائے بلکہ ملائیت سے نبرد آزما ہونے کے لئے اور اس کی حیلہ کاریوں کو ختم کرنے کے لئے اپنے جنونِ محبت سے قرآن کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو — ان کی سجدہ ریزیوں سے ملائیت تو کیا، روحِ زمین تک کانپ اٹھے گی۔ اور پھر روشنی کے مینار اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا خواب پورا ہوتا دیکھ لیں گے — اور اگر یہ قرآن کی بارگاہ میں سجدہ ریز نہ ہوئی اور اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنائے رکھا، تو پھر ملائیت کا فراڈ چل جائے گا۔ اور اس وقت — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟ — ...

سوچنا بھی حرام قرار پا جائے گا۔۔۔ ! اس لئے کہ مذہب ۔۔ سوچنے پر پہرے بٹھانے کا نام ہے۔ اور پھر ملک کا وہ مظلوم طبقہ جو سرمایہ داروں کے ظلم کا شکار ہے اور ملائیت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے، اس کے لئے ایک ہی مثبت اور حقیقی راہ ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کے اندھیروں کو قرآن کی روشنی سے دور کرے۔

حضرات! اقتصادی اور نظریاتی قتل گاہوں سے ذرا ہٹ کر اس خطۂ پاک میں ایک خوفناک غار ایسی بھی ہے جہاں قتل ہونے یا مقتول بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی سرمایہ داروں اور ملاؤں کے باہمی گٹھ جوڑ کی وجہ سے ہے ۔۔ اور یہ خوفناک غار ہمارے ملک کا موجودہ نظامِ تعلیم ہے۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ انسان، اس دنیا میں معصوم بچے کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اُسے جس طرح کا ماحول ملتا ہے وہ اسی طرح کا بن جاتا ہے۔

یہ حقیقت اذیت ناک ہے کہ جس طرح پاکستان کا تیئیس سالہ معصوم وجود قابلِ رحم حالت میں ہے، اسی طرح پاکستان کی فضاؤں میں پلا ہوا نوجوان بھی اس تعلیمی نظام کی وجہ سے ایک زندہ لاش بنا ہوا ہے۔ وہ اساتذہ جو وقت کی رفتار سے کام کی باتیں اخذ کر کے منبرِ تہذیب پر رونق افروز ہوتے ہیں وہ اس ملک میں آفات و مصائب کی ستم ظریفیوں کی مثال بنے ہوئے ہیں ۔۔ یہ صورتِ حال بھی آہیں بھرنے پر مجبور کرتی ہے اور دردمند دل محسوس کرتا ہے کہ ۔۔ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟ ۔۔ لیکن جن جیالوں نے پاکستان جیسی عظیم الشان مملکت کے قیام کے لئے جد و جہد کی تھی اور وہ روشنی کے مینار جنہوں نے قوم کو راہِ منزل بتائی تھی، ان کے حوصلے آج بھی بلند ہیں، وہ اس محاذ پر آج بھی مصروفِ عمل ہیں، اور مایوسی کی چڑیل ان کے سایوں سے پناہ مانگتی ہے۔ تعلیمی صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے "طلوعِ اسلام کالج" امید کی کرن ہے جو پاکستان کے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے روشنی کا مینار رہے گا۔ جب یہ آرزو پوری ہو جائے گی یعنی جب یہ کالج کا قیام عمل میں آ جائے گا تو ملک کے ہر گوشہ میں اس کالج کی آوازِ خزاں رسیدہ فضاؤں کو مبدّل بہ بہار کر دے گی۔ لہٰذا آج جب یہ خیال پیدا ہو کہ مسلمان کدھر جائے، تو میں مشورۃً عرض کروں گا کہ وہ اس کالج کے قیام کے لئے جد و جہد کرے ۔۔ اور یقیناً یہ جد و جہد تاریخ ساز ہوگی۔

حضرات! میں نے اس جد و جہد کو محض جذباتی طور پر "تاریخ ساز" نہیں کہا بلکہ اہلِ علم حضرات پر یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات آئے ہیں وہ دراصل کسی نہ کسی معلّم ہی کا فیضان تھا۔ لہٰذا آج اگر پاکستان کی ناگفتہ بہ حالت کو اقتصادی، نظریاتی اور تعلیمی طور پر بہتر بنانا ہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ کالج کے قیام کی جد و جہد میں شامل ہو کر اپنے خونِ جگر سے تعمیرِ آشیاں کی جائے ۔۔ یاد رکھئے۔ زندگی تعمیر و تزئینِ آشیاں کے سوا کچھ نہیں۔ اور طلوعِ اسلام کالج "تزئینِ آشیاں" ہی کا دوسرا نام ہو گا۔ اور یہ قدم یقیناً تاریخ ساز ہو گا۔

(باقی صفحہ پر)

زیادہ منافع حاصل کیجئے

اپنی رقم قومی بچت کی اسکیموں میں لگائیے

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ

یہ اپنی نوعیت کی واحد سرمایہ کاری ہے جس پر آپ
کی ورثاء سے جتنا زیادہ یقینی طور پر
سب سے بڑا منافع حاصل کرتے ہیں۔
جس پر انکم ٹیکس بالکل معاف ہے
۱۰ فیصد سالانہ شرح منافع کے علاوہ
ان سرٹیفیکیٹ کی خریداری میں
لگائی ہوئی رقم پر بھی انکم ٹیکس
بالکل معاف ہے۔

پوسٹل لائف انشورنس

پوسٹل لائف انشورنس، ملک میں زندگی
کے بیمہ کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو حکومت
کے زیر انتظام ہے۔ اس کا تمام
منافع پالیسی ہولڈروں میں
تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی پریمیم کی
شرح دوسری انشورنس کمپنیوں کے
مقابلے میں بہت کم ہے اور بونس
کی شرح سب سے زیادہ ہے

انعامی بانڈز

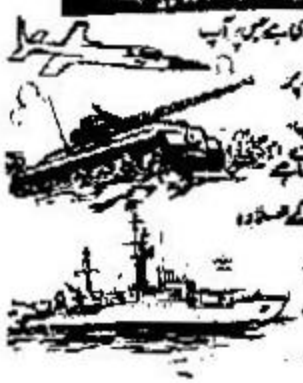

بچت کی بچت، انعام کا انعام
محفوظ بچت کے ساتھ ساتھ ہر مہینے بیشمار
نقد انعامات حاصل کرنے کے
مواقع فراہم کرتا ہے۔ پانچ روپے
والے انعامی بانڈ پر دس ہزار روپے
سے تین روپے تک کے ۱۱ انعامات نکلتے ہیں
اسی طرح بڑی مالیت والے انعامی بانڈز پر بھی ہزار روپے سے تین روپے
تک کے ۱۲ انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔

پوسٹ آفس سیونگز بینک

پوسٹ آفس سیونگز بینک میں
سب سے زیادہ منافع ملتا ہے۔
سیونگز اکاؤنٹ پر ۱/۲ ۵ فیصد
۳ سال تک کے میعادی حسابات پر ۶ فیصد
اور منافع مع بونس سکیم میں ۷ فیصد سے
زیادہ منافع ملتا ہے جو آپ سات سال تک اپنی رقم
جمع کر سکتے ہیں اور اسے کسی وقت بھی نکلوا سکتے
ہیں۔ تمام رقم پر انکم ٹیکس بالکل معاف ہے۔

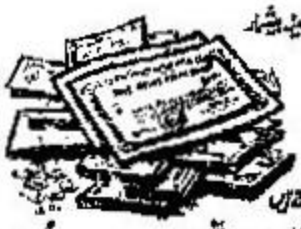

جاری کردہ: سنٹرل ڈائریکٹریٹ آف نیشنل سیونگز - اسلام آباد

ORIENT

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

میرا ایک بھانجہ ہے۔۔۔ پاک نہاد، پاک باز، نہایت شریف النفس، جوانِ رعنا، غریبی میں اپنی محنت سے تعلیم حاصل کی، گریجوایٹ ہوا۔ پولیس میں بطور اے۔ ایس۔ آئی ملازم ہوگیا۔ ماں باپ کی آنکھوں میں اجالا ہو گیا۔ ابھی ملازمت کو چند دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ گاؤں میں قتل کا ایک واقعہ ہو گیا اور "شریکے داری" کی مخاصمت نے اس بچے کو ناحق اس میں ملوث کرا دیا۔ بے گناہی کی خوش اعتمادی سے عدالتِ ماتحت میں مقدمہ کی کما حقہٗ پیروی نہ ہوئی اور سیشن جج نے موت کی سزا سنا دی۔ ہمارے کئی گھرانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی، مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ تختۂ دار پر ایک بے گناہ کے تصور سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل ضروری تھی، لیکن احباب کا مشورہ تھا کہ اس کے لئے چوہدری نذیر احمد خان جیسے ماہر قانون کی وکالت درکار ہوگی۔ مجھے چوہدری صاحب محترم کے محنتانہ کا کچھ کچھ علم تھا۔ اس کے ادا کرنے کی استطاعت نہ بچے کے والدین میں تھی، نہ مجھ میں۔ لیکن ایسے وقت میں ان معذوریوں کا خیال کسے آسکتا ہے۔

میں مجسمۂ غم، چوہدری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے داستان سنی تو فرمایا کہ کیس بڑا الجھ چکا ہے لیکن پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ دعا کیجئے۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے محنتانے کا پوچھا۔ فرمایا کہ پرویز صاحب، مجھے آپ کی مالی حالت کا علم ہے۔ آپ نذیر احمد کی فیس ادا نہیں کر سکتے۔ آپ کی شہادت کہ بچہ بے گناہ ہے، اور آپ کا جو احترام میرے دل میں ہے، اس کے پیشِ نظر میں ایک پیسہ لئے بغیر اس مقدمہ کو لڑوں گا۔ خدا ہماری مدد کرے۔۔۔ وفورِ جذبات سے میری آنکھوں سے دو آنسو چوہدری صاحب کے ہاتھوں پر گرے اور میں خاموش چلا آیا۔

قریب ایک سال کے جانکاہ انتظار کے بعد (جس دوران میں یہ بے گناہ جیل میں رہا) خدا خدا کر کے مقدمہ کی سماعت کی باری آئی۔ چوہدری صاحب نے جس دماغ سوزی، دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے کیس

نیا رکیا اور جس حسنِ تدبر سے اسے پیش کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی قابلیت اور للّٰہیت نے زنجیرِ عدل کو بے ساختہ ہلا دیا اور عدالت نے بے گناہ ملزم کو صاف بری کر دیا۔ ہمارے گھروں کے بجھے ہوئے چراغ پھر سے روشن ہو گئے۔

میری ساری عمر الفاظ کی دنیا میں بسر ہوئی ہے۔ لیکن آج جب میں محترم المقام چوہدری صاحب کے شکریہ کے اظہار کے لئے قلم اٹھاتا ہوں تو ہجوم جذبات، الفاظ کو آگے بڑھنے کا راستہ نہیں دیتا اور میں ہار تھک کر اس سے زیادہ کچھ اور کہہ نہیں پاتا کہ

ہے چرتا شیرسی تغفاں میں ابھی
لوگ باقی ہیں کچھ جہاں میں ابھی

قرآنِ کریم میں ہے کہ۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا۔ (۵/۳۲) جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا ۔۔۔ بجز اس کے کہ اسے قتل یا بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی ہو ۔۔۔ یوں سمجھو گویا اس نے ساری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک بے گناہ کی جان بچائی، یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔

چوہدری صاحب محترم! آپ نے محض حسبۃً للّٰہ ایک بے گناہ کی جان بچائی ہے۔ میرے نزدیک قرآن کی اس شہادت کے مطابق میزانِ خداوندی میں آپ کا یہ ایک پُرخلوص عمل اتنا وزنی ہے کہ اس سے آپ کے حسنات کا پلڑا یقیناً جھک جائے گا۔ وَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ (۱۰۱) اور جس کا حسنات کا پلڑا جھک جائے، اس کی زندگی رضائے خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائے گی۔ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ اور یہ کتنی بڑی سعادت ہے، جسے حاصل ہو جائے۔

میں ان مخلص دعاؤں کے سوا آپ کی خدمت میں اور کیا پیش کر سکتا ہوں ۔۔۔ چہ کند بے نوا ہمیں دارد!

۱۸ دسمبر ۱۹۷۰ء والسلام۔ رہینِ کرم۔ پرویز

بقیہ: مذاکرہ۔ صفحہ ... سے مسلسل (صفحہ ...)

حضرات! آج اگر ہم اپنے سجدوں کی بے ذوقی، دلوں کی پریشانی اور صفوں کی کجی کو ختم کر لیں۔ محبت کے جنون میں اپنے خون پر بھروسہ کر لیں ۔۔۔ تو پھر اس ملّتِ مرحومہ کی شیرازہ بندی سے روحِ محمدؐ پیدا کرنے کی امید کی جا سکتی ہے ۔۔۔ اور یہ بات دل و دماغ سے قبول کر لینی چاہیئے کہ شیرازہ بندی کا اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم ۔۔۔ قرآن کی تعلیم کو راہبر و راہنما تسلیم کر لیں۔

خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو!

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام، بابت نومبر ۱۹۷۰ء) حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے۔

فہرست "ب"

(۱)	محترم ڈاکٹر محمد نواز صاحب۔	لائلپور	۱۰۰/-
(۲)	محترم ڈاکٹر محمد ریاض صاحب	"	۱۰۰/-
(۳)	محترمہ فرخندہ اختر صاحبہ	"	۵۰/-
(۴)	" مس فیض محمد خان صاحبہ	میانوالی	۵۰/-
(۵)	" مسز ڈاکٹر محمد انور صاحبہ	لائلپور	۵۰/-
(۶)	" مسز ڈاکٹر محمد سعید ڈار صاحبہ	"	۵۰/-
(۷)	" مسز ڈاکٹر محمد انور صاحبہ (رحمتی ہسپتال)	"	۵۰/-
(۸)	" مسز ڈاکٹر اختر حسین صاحبہ	"	۲۰/-
(۹)	" مسز ڈاکٹر گل صاحبہ	"	۵۰/-
(۱۰)	" ہمشیرہ صاحبہ ندیم حیات صاحب	"	۱۲۵/-
(۱۱)	" مسز ڈاکٹر حیات ملک صاحب	"	۱۰۰/-
(۱۲)	محترم ندیم حیات صاحب	"	۱۰/-
(۱۳)	محترمہ مسز ڈاکٹر منور صاحبہ	"	۲۰/-
(۱۴)	" مسز ڈاکٹر شہزادہ صاحبہ	"	۱۵/-
(۱۵)	محترم خان محمد اکرم خان صاحب	"	۱۰۰/-
(۱۶)	" ڈاکٹر امیر علی صاحب	"	۱۰۰/-
(۱۷)	" عبدالحفیظ بھٹی صاحب	"	۱۰۰/-
(۱۸)	" چوہدری نذیر حسین عارف صاحب	"	۱۰۰/-
(۱۹)	" عبدالغفور صاحب	"	۵۰/-
(۲۰)	محترمہ ڈاکٹر مسز شمیم منظور صاحبہ	"	۵۰/-
(۲۱)	محترم میاں سردار علی صاحب	"	۵۰۰/-
(۲۲)	" چوہدری شاہ نواز صاحب	"	۱۰۰/-
۲۳	محترم ڈاکٹر نثار احمد چیمہ صاحب	جڑانوالہ	۵۰۰/-
۲۴	بزم طلوع اسلام۔	لائلپور	۱۰۰/-
۲۵	محترم حبیب احمد صاحب	"	۵/-
۲۶	" میسرز ڈائمنڈ انجینئرنگ ورکس	"	۱۰۰/-
۲۷	محترم ظفر اللہ صاحب	"	۵۰/-
۲۸	" عبدالمجید صاحب	"	۵۰/-
۲۹	" چوہدری غلام محی الدین صاحب	"	۱۰۰/-
۳۰	" ذوالفقار احمد صاحب	"	۲۰/-
۳۱	" فضل احمد صاحب	"	۵/-
(۳۲)	محترمہ ڈاکٹر مسز ملک مظفر صاحبہ	"	۴/-
۳۳	محترم علی احمد	لائلپور	۱۰/-
۳۴	" عبداللہ ہاشم صاحب	"	۱۵/-
۳۵	" حبیب احمد صاحب	"	۲۰/-
۳۶	" رانا معظم ارشد صاحب چک ۹۸ ر ب	"	۵۰/-
۳۷	" شیخ اصغر ممتاز صاحب	سرگودھا	۵۰/-
۳۸	" رانا محمد عظیم صاحب، چک ۹۶ ر ب، لائلپور		۵۰/-
۳۹	" چوہدری سردار علی صاحب	"	۱۰۰/-
۴۰	" محمد احمد صاحب	"	۲۵۰/-
۴۱	" حبیب احمد صاحب	"	۱۰/-
۴۲	" چوہدری فضل دین صاحب	"	۲۰۰/-
۴۳	" ماسٹر عبدالعزیز صاحب	"	۵۰۰/-
۴۴	" صوفی احمد دین صاحب	"	۱۰۰/-
۴۵	" بشیر احمد صاحب	"	۵/-
۴۶	" زبیر شبیر صاحب	"	۳/۸۷
۴۷	" ظفر اقبال صاحب چک ۱۹۲ ر ب	"	۵/-

۴۸۔ محترم حافظ محمد یونس صاحب	لائلپور	۲۰/-
۴۹۔ چوہدری محمد ممتاز صاحب۔	سرگودھا	۱۵/-
۵۰۔ محترم چوہدری ریاض احمد صاحب	"	۸/-
۵۱۔ " خان نجیب اللہ خان صاحب	"	۵/-
۵۲۔ " چوہدری عنایت اللہ صاحب	چک ۱۲ شمالی سرگودھا	۵۰/-
۵۳۔ " " مظفر خان صاحب۔	چک ۱۲ جنوبی (")	۲۵/-
۵۴۔ " رانا شیر محمد صاحب	سرگودھا	۱۰/-
۵۵۔ " راجہ محرم علی خان صاحب	"	۳/-
۵۶۔ " چوہدری مراد خان صاحب	کوٹ مومن (")	۱۵/-
۵۷۔ " حافظ اللہ دین صاحب	بھیرہ (")	۱۰/-
۵۸۔ " ملک محمد حیات صاحب	" (")	۱۰/-
۵۹۔ " شیخ محمد حیات صاحب	میانی (")	۱۵/-
۶۰۔ " راجہ خدا محمد صاحب	مڈھ (")	۱۲/-
۶۱۔ " رانا ولی صاحب	سرگودھا	۵/-
۶۲۔ " چوہدری امتیاز احمد صاحب	"	۳۰/-
۶۳۔ " " الطاف حسین صاحب	چک ۱۲ شمالی سرگودھا	۱۰/-
۶۴۔ " " امان اللہ خان صاحب	" "	۱۰/-
۶۵۔ " " محمد نواز صاحب۔	چک ۱۲ شمالی "	۱۰/-
۶۶۔ " " نصر اللہ خان صاحب	" "	۳۷/-
۶۷۔ " " شیر محمد صاحب	بھلوال "	۲۰/-
۶۸۔ لنڈن کی ایک محترمہ جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں		۹۵/۵۰
۶۹۔ محترم محمد ارشاد صاحب۔	گلہڑہ گلی	۱۰/-
۷۰۔ بزم طلوع اسلام۔	کراچی	۴۲۰/-

۷۱۔ محترم ظہور الدین کھٹی صاحب	لاہور	۲۵/-
۷۲۔ " میر محمد شریف صاحب	"	۲۵/-
۷۳۔ " عزیز بیلا رعبدالمجید صاحب۔	ضلع لائلپور	۴۰۰/-
۷۴۔ " شفقت حبیب صاحب۔	سامونکے	۱۰/-
۷۵۔ " محمد حسین شاہ صاحب۔	سیدن جہلم	۵۰/-
۷۶۔ عزیزہ سلمٰی لطیف صاحبہ۔	لاہور	۵/-
۷۷۔ " خالدہ عندلیب صاحبہ	"	۱۱/-
۷۸۔ عزیزہ افتخار حفیظ صاحبہ	"	۲۰/-
۷۹۔ " شوکت پرویز صاحبہ	"	۱۰/-
۸۰۔ محترم محمد زمان صاحب	گکھڑ کہار (جہلم)	۱۵۰/-
۸۱۔ " ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب۔	کرشن نگر لاہور	۲۰/-
۸۲۔ بزم طلوع اسلام۔	کوئٹہ	۷۵۷/-
۸۳۔ محترم چوہدری علی شیر چشتی صاحب۔	بہاولپور	۲۰/-
۸۴۔ " ڈاکٹر محمد رفیق صاحب۔	لاہور	۵۰/-
۸۵۔ " محمد شفیع صاحب۔	بحرین	۱۰۰/-
۸۶۔ محترمہ مسز عبداللہ جمال صاحبہ	لاہور	۲۵/-
۸۷۔ محترم محمد زمان صاحب	عارف والا	۱۰/-
۸۸۔ " ایف۔ ایم منشی صاحب۔	طرابلس	۱۵۰/-
۸۹۔ محترمہ جہاں آرا حامد رضا صاحبہ۔	کینیڈا	۲۰۰/-
۹۰۔ محترم ماسٹر عبدالرشید ارائیں صاحب۔	میرپور خاص	۱۰/-
۹۱۔ " حکیم محمد رمضان صاحب۔	شورکوٹ روڈ	۱۰/-
۹۲۔ لاہور سے ایک واجب الاحترام عالم دین جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔		۱۰۰/-

ایفائے عہد

اکثر احباب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کالج کے لئے ایک ایک کمرہ اپنے خرچ سے تعمیر کرا دینگے۔ اس کا اندازہ بیس ہزار روپیہ فی کمرہ کیا گیا تھا۔ ان وعدوں کے ایفا کرنیوالوں میں محترم شیخ عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ لاہور نے سبقت کی ہے اور مبلغ ۲۰ ہزار روپے کا چیک ارسال فرما دیا ہے۔ ہم اس سبقت پر شیخ صاحب محترم کو مستحق مبارک باد سمجھتے ہیں اور کالج کمیٹی کی طرف سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

تصحیح: نمبر شمار ۵۲، صفحہ ۷۶، شمارہ اگست ۱۹۷۰ء کے سامنے "لنڈن" کی بجائے "بریڈفورڈ" ہونا چاہئے تھا۔ تصحیح فرما لیں۔

(نوٹ) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۷۵/(K)/۲۸۵ مورخہ ۲۵ء، مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مورخہ ۱۳ء کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵/B کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔
سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور